

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

مالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ
نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف
ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے۔ ۲۔ ناظم آباد سنشن : ناظم آباد کراچی ۷۵

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ
نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف
ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے۔ ۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد کراچی ۱۵

جملہ حقوق طباعت و اشاعت پاکستان میں
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی و مجلس علماء دارالمصنفین عظیم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطہ عالم اسلامی مکہ منظم
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل امتیہ مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ

نام کتاب _____ تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)
تصنیف _____ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت _____ احمد برادر پرنٹنگ پریس، کراچی
ضخامت _____ ۳۳۶ صفحات
ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۴

اسٹاکٹ، مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی
ناشر

فضلہ رفیعہ ندوی

مجلس نشریات اسلام اے کے ۲ ناظم آباد مینشن ناظم آباد کراچی

تالیخ دعوت و عزیمت

(حصہ اول)

عربی _____ کویت و بیروت
 انگریزی _____ لکھنؤ، کراچی
 اردو _____ لکھنؤ
 اردو _____ کراچی

فہرست

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بانی	۹	دیباچہ طبع دوم
۳۵	تفاوت کے بعد ان کی زندگی	۱۱ — ۱۶	پیش لفظ
۳۷	ان کی انقلابی اصلاحات		مقدمہ
۳۸	اعمال و اخلاق کی طرف توجہ		اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل
۳۹	تدوین علوم و ادبیات سنن	۱۷ — ۳۰	
۴۰	چند خطوط و قرائین	۱۷	زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے
۴۸	تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ	۱۸	امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے
۴۹	ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا ردِ عمل	۱۸	اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات
۵۰	ان کی زندگی کا جوہر	۱۹	اسلام کے قلب و جگر پر حملے
۵۱	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات	۲۰	دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی
	دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت حسن بصری	۲۶	مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت
	۵۳ — ۶۸	۲۷	ہر نئے فتنے اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت
۵۳	امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف	۲۸	تاریخ کے گم شدہ مآخذ
۵۴	تابعین کی دعوتِ ایمانی	۲۹	اسلام کی میراث
۵۵	حضرت حسن بصری		پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز
۵۵	حسن بصری کی شخصیت ان کی داعیہ صلاحیتیں	۳۱ — ۵۲	
۵۷	حسن بصری کے مواعظ	۳۱	عہدِ اموی میں جمالی رجحانات و اثرات
۶۳	ان کی حق گوئی و بیباکی	۳۲	عہدِ اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر
۶۳	اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین	۳۳	انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی شکلات

۹۶	واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے	۶۵	تفاق و منافقین کی نشاندہی
۹۹	بے نظیر عزیمت و انتقامت	۶۷	حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت
۱۰۰	امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ	۶۷	انقلاب حکومت کی کوششیں
فقہ الاعتزال اور ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو		خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر	
۱۰۳ - ۱۱۸		۷۲ - ۷۹	
۱۰۳	معز لکھا علمی اقتدار اور اس کے اثرات	۶۹	خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات
۱۰۴	سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت	۷۰	بغداد کے داعی الی الشر
۱۰۵	امام ابوالحسن اشعری	تدوین حدیث وفقہ	
۱۰۶	امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق	۷۳ - ۸۳	
۱۰۶	ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات	۷۳	امت کی دو فوری ضرورتیں
۱۰۸	ان کا مسلک اور ان کی خدمات	۷۵	تدوین حدیث
۱۱۳	ان کی تصنیفات	۷۵	محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی
۱۱۴	عبادت و تقویٰ	۷۶	فن اسما و الزجال
۱۱۴	وفات	۷۷	محدثین کی احتیاط و امانت
۱۱۴	امام ابو منصور ماتریدی	۷۸	قوت حافظہ اور استحضار
۱۱۶	اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر	۷۹	مجالس درس میں سامعین کا ہجوم
علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ		۷۹	صحاح ستہ
اور		۸۰	تدوین فقہ
ایک نئے متکلم کی ضرورت		۸۱	ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات
۱۱۹ - ۱۲۹		۸۲	ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین
۱۱۹	علم کلام کا انحطاط و انحطاط	۸۲	تدوین فقہ کا فائدہ
۱۲۰	فلسفہ کا رواج	فقہ اخلق قرآن اور امام احمد بن حنبلؒ	
۱۲۱	فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح	۸۴ - ۱۰۲	
۱۲۱	جماعت اخوان الصفاء اور اس کے رسائل	۸۴	فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں
۱۲۲	معز لکھا و فلاسفہ کا فرق	۸۵	معز لکھا عروج
۱۲۳	باطنیت کا فتنہ	۸۶	امام احمد بن حنبلؒ
۱۲۴	ظاہر و باطن کا مغالطہ	۹۴	فقہ اخلق قرآن
۱۲۶	نبوت محمدیؐ کے حقائق و غاوت	۹۶	امام احمد ابتلا و امتحان میں

۱۹۶	بنداد کے دوداعی	۱۲۸	ایک نئی شخصیت کی ضرورت
	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۱۹۴-۲۲۴		امام غزالیؒ ۱۳۰-۱۹۶
۱۹۴	تعلیم و تبحر	۱۳۰	تعلیم اور علمی عروج
۱۹۸	اصلاح و ارشاد اور رجوع عام	۱۳۱	گیارہ سال کی رہ توردی اور اس کے تجربات
۱۹۸	محامد و اخلاق	۱۳۲	خلوت سے جلوت کی طرف
۲۰۱	مردہ دلوں کی سمجائی	۱۳۱	امام غزالیؒ کا تجدیدی کام
۲۰۲	تعلیمی مشاغل و خدمات	۱۳۱	فلسفہ پر عمل جراحی
۲۰۳	استقامت و تحقیق	۱۳۵	تہافت الفلاسفہ کا اثر
۲۰۴	تقویٰ و توحید	۱۳۵	باطنیت پر حملہ
۲۰۵	خلق خدا پر شفقت	۱۳۶	زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ
۲۰۶	حضرت شیخ کا عہد اور ماحول	۱۳۶	احیاء علوم الدین
۲۰۸	سواخط و خطبات	۱۳۸	تغیید و احتساب
۲۰۸	توحید قائل اور غیر اللہ کی بے حقیقتی	۱۳۹	علماء و اہل دین
۲۱۲	شکستہ دلوں کی تسکین	۱۵۶	حکام و سلاطین
۲۱۳	دنیا کی صحیح حقیقت	۱۶۲	مسلمانوں کے دوسرے طبقے
۲۱۵	خلفاء اور حکام وقت پر تنقید	۱۶۴	ایک اصلاحی و تربیتی کتاب
۲۱۴	دین کے لئے دل سوزی اور فکر مندی	۱۶۸	احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق
۲۱۸	بیعت و تربیت	۱۶۸	حب جاہ
۲۲۱	زمانہ پراثر	۱۷۷	محاسبہ نفس
۲۲۱	وفات	۱۸۲	احیاء کے ناقد
علامہ ابن جوزیؒ ۲۲۵-۲۵۱		۱۸۲	امام غزالیؒ اور علم کلام
۲۲۵	ابتدائی حالات اور تحصیل علم	۱۸۴	تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالیؒ کی سہولت
۲۲۶	کتابت حدیث میں انہماک	۱۸۹	بقیہ زندگی اور وفات
۲۲۶	ذوق مطالعہ	۱۹۰	امام غزالیؒ کی دو ممتاز خصوصیتیں
۲۲۷	تصنیف و تالیف اور تبحر علمی	۱۹۲	امام غزالیؒ کا عالم اسلام پراثر
۲۲۷	تقویٰ اور ذوق عبادت	۱۹۵	عمومی دعوت و تذکرہ کی ضرورت و مصلح عام اور بندہ کے داعی الیٰہ
۲۲۷			داعی کی علمی صلاحیتیں

۲۶۶	فتح بیت المقدس	۲۲۹	ظاہری محاسن و اوصاف
۲۶۸	اسلامی اخلاق کا مظاہرہ	۲۲۹	بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق
۲۶۹	صلیبی سیلاب	۲۳۲	محاسن و غلط اور تاثر
۲۷۰	صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل	۲۳۳	ان کی ناقذانہ تصانیف
۲۷۳	وفات	۲۳۳	کتاب الموضوعات
۲۷۴	درویش سیرت سلطان	۲۳۴	تبلیس ابلیس
۲۷۷	محاسن اخلاق	۲۳۴	مختلف طبقات پر تنقید
۲۷۹	مردانہ اوصاف	۲۳۹	صید الخفا
۲۸۱	علم و فضیلت	۲۴۰	عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج
	فاطمی حکومت کا زوال اور سلطان صلاح الدین	۲۴۲	واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ
۲۸۲	کا دوسرا کارنامہ	۲۴۶	سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت
	شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلامؒ	۲۴۷	صلحاء امت کی سیرت
	۳۰۲ - ۲۸۷	۲۴۷	تاریخ کی اہمیت
۲۸۷	علمی عظمت	۲۴۹	تاریخی تصنیفات
۲۸۹	سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی فرخواری	۲۵۰	ادبیت و خطابت
۲۹۱	بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت	۲۵۱	وفات
۲۹۳	شیخ عز الدین مصر میں		نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبیؒ
۲۹۳	شیخ کی حق گوئی و بیباکی		۲۵۲ - ۲۸۶
۲۹۵	فرنگیوں سے جہاد	۲۵۲	صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ
۲۹۵	مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام	۲۵۴	اتابک عماد الدین زنگی
۲۹۶	امراء سلطنت کا نیلام	۲۵۵	الملك العادل نور الدین زنگی
۲۹۷	شیخ عز الدین اور سلاطین مصر	۲۵۶	نور الدین کے محامد و اوصاف
۲۹۸	مکام اخلاق	۲۵۹	شوق جہاد اور ایمان و یقین
۲۹۹	امراء المعروف اور نہی عن المنکر اور شیخ کا مسلک	۲۶۱	سلطان صلاح الدین ایوبی
۳۰۱	شیخ کی تصنیفات	۲۶۲	زندگی میں تبدیلی
۳۰۲	شیخ کی وفات	۲۶۳	جہاد کا عشق
	فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ۳۰۳-۳۳۳	۲۶۴	حطین کی فیصلہ کن جنگ
۳۰۳	تاتاری حملے اور اس کے اسباب	۲۶۵	سلطان کی دینی حیثیت

۲۵۴	رفقار کے انتخاب کا سبب	۳۱۴	اسلام کے شرقی مالک تماریوں کی زو میں
۳۵۵	مولانا کی وفات	۳۱۴	ہندو کی تباہی
۳۵۷	اخلاق و خصوصیات	۳۲۲	تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت
۳۵۷	ریاضت و مجاہدہ		مولانا جلال الدین رومیؒ
۳۵۸	نماز کی کیفیت		۳۰۰ - ۳۰۸
۳۵۹	زہد و قناعت	۳۳۵	علم کلام و عقلیت کا بحران
۳۵۹	فیاضی و ایثار	۳۳۷	صاحب دل مکلم کی ضرورت
۳۵۹	بے لکھی اور فنایت	۳۳۷	مختصر حالات
۳۶۰	کسب حال	۳۳۸	خاندان اور والد نامہ دار
۳۶۰	اہل دنیا سے کیسوی	۳۳۸	مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم
۳۶۰	ثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و مقام	۳۳۹	والد کی لکھی سے ہجرت
۳۶۰	ثنوی معنوی	۳۴۰	مولانا قونیہ میں
۳۶۲	عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید	۳۴۱	آپ کے تعلیمی سفر اور شاغل
۳۶۸	دعوت عشق	۳۴۳	انقلاب حال
۳۷۳	جہان دل	۳۴۳	شمس تبریز
۳۷۵	مقام انسانیت	۳۴۴	مولانا کی ملاقات اور توفیق عظیم
۳۷۹	دعوت عمل	۳۴۶	شورش عام
۳۸۲	عقائد و علم کلام	۳۴۶	شمس کی غیبت
۳۸۳	دوبارہ	۳۴۷	مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی
۳۸۶	نبوت اور انبیاء	۳۴۸	شمس کی دوبارہ غیبت
۳۸۹	سجاد	۳۴۹	مولانا کی بیابانی
۳۹۲	حیر و اختیار	۳۵۱	سفر شام اور سکون خاطر
۳۹۳	علمت و ملول	۳۵۱	شیخ صلاح الدین نرگوب
۳۹۷	ثنوی کا اثر	۳۵۲	چلی حسام الدین
۴۰۱	اشارہ (آئینہ) از محمد بنات الدین ندوی	۳۵۴	ثنوی کی تحریک

دیباچہ طبع دوم

”تاریخ دعوت و عزیمت“ حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر ناچیز مصنف کتاب الشہ تبارک و تعالیٰ کے حضور میں بہ ہزار زبان شائع ہوا اور پیاس گزار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آ رہی ہے، لیکن اس کی وجہ کتابوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں، اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے خم میں جتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کر دی، اس کے لئے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور معذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ مواد وہ وسیع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت و افادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان ”فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش“ کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون

کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی، معاشرتی

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس فتنہ عالم آشوب اور طوفان بلائیز کے باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الہی قانونِ جازاۃ کی مدد سے معلوم کرنے اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی اور مصنف کی بعض معذوریوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایسا ہی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے جس کو بہت آگے بڑھایا جاسکتا ہے، بایں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و مواعظت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی کے زیر عنوان کیا گیا ہے جس میں مسیحیت، اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس ایڈیشن میں صرن پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور جن کا تذکرہ پیش لفظ میں کیا گیا ہے ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أَنِيبُ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم الشریعہ بریلی

۳۱ مئی ۱۳۸۹ھ
۳۱ اپریل ۱۹۶۹ء دوشنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ رفقاء کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہنچایا جائے، ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان ”اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں“ تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، اجاب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے، اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہئے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل نمایاں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جنہوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی

حیثیت سے عہدِ انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و علمی کارناموں میں کوئی بہت اور نہرت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷-۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندول طاق و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آوی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک حساس گہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں، بد قسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو جنہوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدِ باب کیا ہے اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلہ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و تنحوی کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط و ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے

کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کیسا ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی افتادہ سرسری طور پر گزرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے، اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس ضمن میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جاسکتے، مگر دین کی تجدید احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:-

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور ضلارہ گرا، تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا

جاسکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لاکر اپنے زمانہ کے پیانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فرد گذشتوں

کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی انظر گوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی نا انصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے، ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۳) کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطف صحبت اور شرف ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحب دعوت مصلحین، مصنفین اور اصحاب فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور میسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ دید و شنید کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزرا، اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزائے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحب ترجمہ کی زبان و ادب کے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابل اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح چوب خشک اور ناقص

بے ضمیر ہونا چاہئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ

ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہل دعوت و اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوق عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے، تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجائی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا بسوط ہو گیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہل دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مولف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدت تصنیف، جیسا سکون خاطر،

جتنا وسیع و وسیع مطالعہ اور جیسا وسیع اور متنوع علم و کار ہے مصنف اس سے ہم دہند نہیں لیکن جو کچھ بھی
 اس عرصہ اور ان حالات میں ہو سکا اور جو ناظرین کے سامنے ہے وہ مصنف کی پریشان خاطر سی انتشار و ہستی اور
 علمی بے یقاعتی کے پیش نظر محض تائید الہی اور توفیق خداوندی ہے۔ **حکما لا تدرک الامور بحسب**
القدر۔

ابوالحسن علی مدوی

دارہ معرفت شاہ علم اللہ رائے بریلی

۳ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا

نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا

اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت

(المائدہ - ۳) سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا

شباب ہر وقت قائم ہے۔ ع

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سداجواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر

جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی

رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور

ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو

(اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہوا اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا

ذَٰلِكَ تَقْنِیُّوْا الْعَرْزَ الْعَلِیُّہٗ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اٰلِهٖ الَّذِیْ اَتَقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (الطہ ۶۸) کاریگری الشریکی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

اُمّتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمّت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا آسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور محبوباً یا نفراً اس دین کو نازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخِ عالم میں

جیسی ”مردم خیز“ ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ خاص اتفاقی بات نہیں ہے۔

بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دین میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور ہر کو جس تریاق کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

۱۔ کم کے قلب و جگر پر حملے

شرع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لے سکتا۔ دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہا سہا کر لیا اور انہوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی پورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا بھر کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھود دیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریقات، تاویلات، بدعات، عجبی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے سامنے سپردال دے، لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے تحریقات و تاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور دین خالص کو اجاگر کیا، بدعات اور عجبی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُر زور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کڑی ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین" کی سخت مذمت کی، اور جہاد اسلامی کے سامنے

یہ منکر و تمردوں اور مستغنی آسودہ حال اور فانی اہمال لوگوں کو قرآن مجید مترفین کے لفظات یاد کرتا ہے۔

کلمہ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے اور طاقتور اور دلاویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی 'یدِ بریضا' تھا جس سے انہوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریقات و بدعات کے ترغیب سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمر بستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی، جس کی نظر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرک مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے

دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مترادف تھی جس میں

پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں ٹکی تھی اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تفہیم کے طریقہ پر تشریح اور ان معجزوں کو پیش گوئیوں اور شاہوں سے بھرنے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب یسانی (ESSENIO) کا دایا ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے جس کو آرتھوڈوکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے۔“

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفاء اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط فہم اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

فصلاً کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں کئی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:-

”اگر ہم اس کے احباب تلاش کریں کہ سوہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی۔
دوسری جگہ لکھتا ہے:-

”یہ سچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز دینے کا لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپ میں تاریخ کی ایک جانی بو بھی حقیقت ہے۔“

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:-

”سوہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثناء ان سب کو کلیسا کی لعنت و لعنت کا شکار ہو جانا پڑا تھا۔“

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوهام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لو تھرنے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔ غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سرخوش دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم بڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا یا

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرنا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے

ان زبردست تھیسٹروں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہو کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے غور و ابوس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالص کائنات سے براہ راست روحانی نسبت بالکل کھودی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دوا اہم بنیادیں تھیں جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمراہی کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک

نویا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب بہت سرعت

کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور شرقی حصہ پر جو ہند اور بکر انکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہو گئی، مورتیا اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں سجدگی اور بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشوراپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں :-

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی، جس میں اوتاروں کی بھرا، اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھائی

دینے لگا، سنگھوں کی فضایل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور بدعتیں کے بعد دیگرے نظر آرہی تھیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں یہ دھمت کے بگاڑ اور

تدیریکی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولت مند ہو گئے، اور ایک خاص عبادت

کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اداہم داخل

ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تشریف شروع ہو گیا، اس عہد

میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYS DAYIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں اگر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور

اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضائیں

لے بودھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبداء و معاد کے سلسلہ میں کوئی عقیدہ یا نظریہ

نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہ رائے ہے، دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

۵۵ ہندوستانی تمدن (اردو) ایشوراپا۔

ذہن کی ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔^۱

بحوثی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی، اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے، اور اس جدید اور مخرب مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی کم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔^۲

غرض قدیم ہندو مذہب بودھ مت کے سامنے بالکل پنیپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شکر آچاریہ^۳ نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم روبروال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرات اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالق کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی اہمیت پر قائم ہیں اور دورِ انحطاط کی میراثِ رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کے مفالہ نگار (V. S. GHATE) جو الفسٹن کا بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

”اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظامِ مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی ”ادیشید“ میں تسلیم دی گئی ہے“

اس نے سطلن وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوتیشید" اور بھگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے، شکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہ مخالفت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوونما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی، ہم اعلانِ منزل اور رموز کو ترک کر دینا چاہئے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے، شکر نے بتوں کی اجازت دینے کی بجائے ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے رہنوں کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابلِ تبدیل ہوں۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور کانگدھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیاء تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرتِ سلیم اور تفسیرِ پذیر عہدِ سکے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپردِ حال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

در اصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

لے ماخوذ از مقالہ شکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین اور جانیت کے لیے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح چھونک دیں اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت ہواں ہیں مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ سیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی ہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابل میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

بہرئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی، حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلام کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو، اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف

کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں جو قدریت، جہیت، اعتزال، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تخریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی سلسلہ ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملاحظات اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پُر اثر اور باریک مجلسوں کی روئے ادب و پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو اخلاقی سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر مکتبہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر

کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس امت کے ہر دور اور ہر محلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں اور انھوں نے کبھی اس کو بالوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہل مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلام سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنت سنید، اخلاق عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نووارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریح کا خزانہ عامرہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پکھل کر تنقید کی، اور صحیح حقیقی اسلام کی بر ملا آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دلی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تند و تیز دھار کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلا خیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے کے

سے محفوظ رکھا جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے درپے خارجی حملوں کو سہا لیتے کی قوت عطا کی جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دایم محبت سے اس دشمن کو شکا کر کیا، جو زورِ شیعہ اور لوک خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو خلیفہ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و مبلغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیرِ دِام کیا جو علیٰ جمہات اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے، اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعتراضِ حقیقت کا نام ہے۔ ہر ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ریش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دور بین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجسمہ نہ پہنچ پاتا، جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور عظمت کا دافر سامان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے الحمد للہ صحت میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنہوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ و بید اللہ التوفیق

پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور
عمر بن عبدالعزیز

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا کتاب سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور مصالح ملکی بن گیا، تفاخراؤ عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا، اور جو بادیہ عرب میں پناہ گزیں تھی، پھر واپس آ گئی، قبائلی غرور خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہزاروں محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے،

لہ اس سلسلے میں جاہلیت کا جذبہ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دھچک واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو ابو الفرج اسفہانی نے اغانی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں جو شب اور عکرمہ کے درمیان عرصہ سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ زیادہ ہوتا ہے اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلے میں جو شب کا پیرا اکثر بھاری رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صد ابوریان آئے کی خریدیں اور اپنے قبیلے میں تقیم کر دیں کہ آٹا گوندھ دیا جائے اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا اور اوپر سے گھاس ڈال دی اور اس کا انتظام کیا کہ جو شب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں مت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گوندھتا ہے کہ گھوڑا اس میں گر گیا، لوگ شامش دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی، اور سارا جسم (باقی صفحہ پر)

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسے سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعرا و خوشامدی درباریوں اور آبرو باختر مصائبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس پر مسلمانوں کی دولت بیدل صرف ہوتی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی، گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہنچ گیا تھا، حکومت کی غلط روی اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریت سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تکین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے اور اپنی تلہیت اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظام کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے بڑا اثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آباء السلام) کی تھی جو عبادت و تقویٰ اور زہد و تواضع میں اپنی نظیر نہیں

(باقی ص ۳۳ کا) ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بیوں سے اس کو بڑی شکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی اور شعرائے اشعار کبھی اس طرح عکس کرنے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کرتی، اور اپنا تفوق تسلیم کر دیا (از رنات اخلاص جلد ۱ ص ۱۳۹-۱۴۰)۔
۱۵۱ھ اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر و خطیب (م ۹۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا کہ گلے میں سونے کی سیلے تھیں اور وارڈی کے بابوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے، اور کوئی اس کو ٹکے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۷ ص ۸۷)۔

۱۵۵ھ اس کا انمازہ اس واقعہ سے ہو گا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مخنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہر کیا، سننے والوں کا اس قدر حیرت ہو کر چھت بیٹھ گئی، اور خدا حنین دہ کر مر گیا۔

(اغانی ج ۲ ص ۱۲۲-۱۲۳)

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک

اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجرِ اسود تک نہیں پہنچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کا لی کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے با ساقی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ حتراتا راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہدِ اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہلِ عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلاء تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہ بن الزبیر مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقشِ قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی بھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

لے حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا، ۱۲۰ ۵۷ قیصدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هَذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْءَ وَطَأْتَهُ وَالْبَيْتَ يَعْصِيهِ وَالْحِجْلُ وَالْحَرَمُ

محققین کا خیال ہے کہ اس قیصدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفحہ ۵۶۰ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرہ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب اخلاق و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک ہیں: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ، کام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر ہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کی ذات ہے، جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سب جو گلہ اسی لئے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفہ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کرے۔

عمر بن عبدالعزیزؓ سلاطین میں پیدا ہوئے، وہ خلیفہ اوقت سلیمان بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی خلافت

لے اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے سادہ کردی کو والی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کمر رہا ہے، بڑی صبح ہو رہی ہے، دودھ میں پانی ملائے، لڑکی نے جواب دیا کہ لالہ آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس کی ممانعت کی ہے؟ عورت نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے لہجے سے ایسا جو انفرادی پیدا ہوگا جو سامنے

عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا، عمر بن عبدالعزیزؓ اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۸۱ء)

نئے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستے سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دیتے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبد الملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لابی لابی قبائیں پہنائیں اور ہتھیار باندھے کہ وہ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں جینے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، ذیاء بن حنیہؓ نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجا کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبد العزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلاتا خیران چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا بوسا مان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اسی گھر ہی سے ان کی سیرت کیس بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جو اری او باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسرئی و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور

مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقرا میں بھی ملتی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی

کی کہ بعض اوقات کڑتا سوکھنے کے انتظار میں جموں میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا، اپنی امیتہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا پٹا ملا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتے ہیں، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں، اس وقت جبکہ وہ روتے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سپا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی ضرورت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے، اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے منگ کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا، ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور جرس ہوں گے، والی مدینہ ابو بکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبد العزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابو بکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جائے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلنے نہ تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

اور قندیلےں کافی ہیں انہی سے تم کو کام لینا چاہئے، اسی طرح کی ایک درخواست چرس میں سرکاری کام کے لئے کافی طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ۔

”قلم باریک کر دو اور گٹھا ہوا لکھو، اور ایک پر چرس بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی ہی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواجہ ادبیت المال پر بار پڑے۔“

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ۔

”حمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔“

حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابل میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابل میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی

وَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ إِنْ شَاءَ اللَّهُمْ وَلَا تَعْتَوْا

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنایا ہے، چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کئے تھے ایکس معاف کر دیئے، خشکی اور سمندر کے راستوں کو کھولنے کی ہدایت کی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لئے کیساں پیمانے مقرر
کے، جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، احکام و اعمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا، سلطنت کی
زمین کا خاصا رقبہ امرا اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکار گاہ یا چراگاہ کے لئے گھیر کر بیگار بنا رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ
عوام کی ملکیت ہے، اعمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے،
حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہنچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقع پر اعلان
ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اس کو ستر سو دینار تک انعام ملے گا۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاقی کی طرف توجہ کرنے کی

له مناقب عمر بن عبد العزيز ٦٣ (طبع يوريب) ٥٤ سيرت عمر بن عبد العزيز ١٢٣ ٥٥ ايضاً ٩٩ ٥٥ ايضاً ٩٩ ٥٦ ايضاً ٩٩

نہ فرصت تھی نہ اہلیت نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و برحمانات کی نگرانی کرے اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبد العزیز نے اس دہلی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے، جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہد نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں، عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں، اپنے اپنے علاقہ اور صلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں اور اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں، ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے، عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں، پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بداخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، فوج گری اور خیارہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں، بعید کے استعمال میں بڑی بے اعتدالی شروع ہو گئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں۔

تدوین علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کی احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابو بکر بن حزم جو ایک

بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:۔

انظر ما كان من حديث رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں
 صلی اللہ علیہ وسلم فآلکته فآتی حقت
 ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس کو مجھے اندیشہ ہے کہ
 دروس العلم و ذهاب العلماء۔ علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔

انھوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبد الرحمن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرہ روایات کی
 طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابو بکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور شاہیر
 علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:۔

انظر والی حدیث رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر
 علیہ وسلم) فاجمعوا
 جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کئے کہ وہ کیسوی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔
 وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی
 دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ:۔

”اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی اور جو عمل نہیں کرے گا،
 اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمہیں ان پر چلاؤں گا، اگر
 اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا کر لیں بھی نہیں ہوں۔“

چند خطوط و فرامین

میدنا عمر بن عبد العزیز کے قالب میں جو خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کا فرما تھی، (اور جو بالآخر ان کے

لے تاریخ امویان (الونیم) لے سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۱۱۷ ص ۱۱۸ صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنی الامام علی بن

(نظام سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) ۲۱ کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً

سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں اور شاہان بنی امیہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کے ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدیدار موسیٰ کے ”نودولت“ جاہلیت کی رسم حلف و محالفت کو زندہ کر رہے ہیں، اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر ”یا لبثی فلاں، یا لمضری فلاں“ قبیلہ کی دہائی ہے، ہاں اے اہل مصر اپنے حلیف کی مدد کرو) کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ، اخوت اور نظام اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا، اور بہت سے قتنوں کا پیش خیمہ سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ممالکی مصالح سے شہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بارے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار ضحاک ابن عبدالرحمن کو لکھتے ہیں:-

”حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی، اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا:-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
تہا ہے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی، اور ایک کتاب آئی، جس سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو
يَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
مسئلہ السلام دینی جمہور مبین التلکات الی
وہائے حق کے طالب ہیں، سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی
النُّورِ بِآذَانِهِمْ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
توفیق سے تارکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں، اور

ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

(المائدہ - ۱۶/۱۵)

جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف بن جاتا تھا، پھر وہ جاہلیا اس کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:-

وَيَا نَحْيَ أَنْزَلْنَاهُ وَيَا نَحْيَ نَزَّلْنَا وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور
وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہو گیا، اور ہم نے آپ کو
مرتب خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔
(اسراء ۱۰۵)

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم لے
اہل عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی، اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فتنے، تباہی
در بیان عام تھے، لوگ تم کو دبائے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا، اس سے بھی تم محروم
تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا
تھا، وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ
اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ و جدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچایا،
تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور
اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا،
کہ لوگ انہیں اچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرما
جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ
کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں
کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ
دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ
الْمُشْرِكُونَ
وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا
دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب
کے، گو مشرک کیسے ہی تاغوش ہوں۔
(الصفت - ۹)

بعض آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے ارشاد فرماتا ہے کہ:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے خوف کے بعد اس کو بدل دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے لئے وعدہ کو پورا کر دیا اے اہل اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ بنو گے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے اور نہ کوئی حجت نہ کوئی بچاؤ ہے اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-

تِلْكَ الْأَمْثَلُ الْآخِرَةُ يَجْعَلُهَا اللَّهُ لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (سورة القصص ۷۷)

یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا اور نہ تکبر۔ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے ہیں امت میں جو فحش و فحاشی و فساد و فحاشی اور انتشار برپا ہوا وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے اس سے رک جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وحید سے

زیادہ، کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے.....
 جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھتے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے
 ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو تھے سنی حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ بچائے اجداد اور جاہل قوم کے لوگ
 ہیں احکام الہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے سامنے سخت دھوکے میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ
 رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے،
 جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور مہین
 والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حمایتی اور ولی ہیں، بحان اللہ
 دہمدمہ! یہ کس قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت و ذلت و خواری کا کیسا شوق ہے؟ دیکھتے
 نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا، کس امن و امان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا
 تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے،
 کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا:-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ
 اَخْوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
 مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں
 کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے
 رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔
 (الحجرات ۱۰)

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟:-
 الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَقَسْتُ عَلَيْكُمْ
 نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا
 آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور
 میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام
 کو تمہارا دین مینے کے لئے پسند کر لیا۔
 (المائدہ ۳)

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانہ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے اور ارشاد ہے "لا حلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور جھوٹے بندے نہیں ہیں) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتہ محالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو.....

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط مٹے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے مذہود سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بنا رہا ہوں جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں اور جو ہر شخص کی شرک سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔

انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطہ نظر اور طریق فکر دنیا دار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:-

"اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المومنین نے ان کو اہل حربے اور ان اہل صلح سے جو مقابلہ میں آئیں جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المومنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان موثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو اس
 دراصل ہم مقابلہ کی قوت نہیں ہے کیونکہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان
 ان کے سامان کے برابر پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں
 ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے یاد رکھو! اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پاسکیں گے تو اپنی قوت کی
 وجہ سے بھی ان پر غالب نہ پاسکیں گے اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں جہاں تک
 ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی جانسی تم پر کچھ محافظ مقرر
 کئے گئے ہیں جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جاننے ہیں پس ان سے شرم کرو اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ
 حسن سلوک کرو اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہونچاؤ خصوصاً ایسی حالت میں کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ
 تم راہ خدا میں نکلے ہو اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے گئے گئے ہیں اس لئے گو ہم گناہ کا رہا
 لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے
 بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے پس اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ
 سے تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔
 اور امیر المؤمنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں،
 اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں جو مشقت میں مبتلا کر دے اور سفر میں کسی ایسی
 منزل پر پڑاؤ سے گریز نہ کریں جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا
 ہو کہ سفر کے تکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا نہ دیا ہو وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں جو اپنے گھروں میں ہیں
 ان کا سامان اور سواریاں سستائی ہوئی ہیں پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سوار یوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ
 نہ کریں گے تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں جہاں
 ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں اور آرام کریں جس میں
خود کو اور جانوروں کو آرام پہنچائیں اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں اور امیر المؤمنین
ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں امن و امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں
میں سے کوئی نہ جائے نہ ان کے بازاروں میں نہ ان کی مجلسوں میں ہاں وہ شخص جاسکتا ہے جس کو اپنے
دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں
اور نہ ان کو کچھ اذیت پہنچائیں سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو کیونکہ ان کا حق
اور ان کی ذمہ داری ہے جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے جس طرح کہ
وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلف ہیں پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم
رہیں تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو اور صلح والوں پر ظلم نہ کر کے جنگ لے ملکوں پر غلبہ حاصل کرو قسم
الشر کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت
ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے
اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے اور شرک لے ملکوں کی
طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹائی ہے اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوبست
کر سکتا تھا اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا ہم نے تمہارے لئے قوت کی ہم رسائی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی
اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے "وَلَا تَحْزَنْ وَلَا تَأْتِ الْهَيْبَةَ" اور امیر المؤمنین کی ہدایت ہے کہ ان کے
جاسوس عرب اور اہل ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پران کو اطمینان ہو کیوں کہ
دروغ گوئی اطلاع نفع نہیں پہنچاتی اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو فریب دہندہ دراصل
تمہارے دشمن کا جاسوس ہے تمہارا جاسوس نہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ

ایک عمومی خط میں عمالِ سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:-

”اتما بعد بیشک یہ ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد فرمائی ہے اگر میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کھانا، لباس، سواری یا شادیاں یا جمع اموال ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے پہلے ہی یہ چیزیں اتنی دے رکھی تھیں جو شکل سے لوگوں کو ملا کرتی ہیں، لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ عظیم الشان ذمہ داری ہے اس کی باز پرس بڑی سخت ہے جس وقت فرنی اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے تو اس کے معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور نظر انداز فرمائے اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں ان میں سے تم کو احتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، ذمہ داریوں کی ادائیگی، اور اللہ تعالیٰ کے ادا کر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں جو باتیں اس کے خلاف ہوں، ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں، تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر ہے، اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہنچائیں اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو، وہ تمہارے پیش نظر ہے، اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤ، اس یوم موعود کے لئے وہی چیز تیار رکھو، جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں، جن کے برابر بہارِ ادعٰی و نصیحت مؤثر نہیں ہو سکتی۔ وَاللّٰهُ

تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبد العزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

۹۲-۹۳ ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔

اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ کی اور اس میں ان کو اپنے صدق و اخلاص کی برکت اور اپنی زندگی و عمل سے اسلام کی صحیح اور مؤثر نمائندگی کی وجہ سے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ ————— بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے :-

”عمر بن عبد العزیز نے ہندوستان کے راجاؤں کو سات خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا، اور ان کے حقوق و قرآن و ہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

ان کے اخلاق و کردار کی خبریں وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اس لئے انھوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے نام عربوں ہی کے نام پر رکھے۔

جب اسماعیل بن عبد اللہ بن ابی المہاجر مولیٰ بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اپنے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا اور اہل بربر کو اسلام کی دعوت دی، حضرت عمر بن عبد العزیز نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، یہ خط اسماعیل نے جموں میں پڑھ کر سنایا، اور اسلام بالآخر وہاں غالب آیا، اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کر دیا، لیکن جو لوگ اسلام نہ لائے اور ساتھ ہی انھوں نے سرزمین تمیر کیسے ان کے لئے انعام اور وظیفہ مقرر کیا۔^{۵۳}

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل

عمر بن عبد العزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہو گئی۔

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یہی بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس کو زکوٰۃ دی جا سکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لئے کراتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب لید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ لید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل ملک پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کرو گے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوت محرکہ

ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمران کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ
يَعْلَمُ عَظِيمٌ (الانعام ۱۵) بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا، میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشاق و تمنیٰ ہے، ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کر ان کے سامنے جوا نکلیٹھی رکھی تھی، وہ بچھ گئی، یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبد العزیز اور حسن بصری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

عمر بن عبد العزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبد العزیز کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتااتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیہ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے سن ۶۴۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔



دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں خلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے بچے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس "ناپسندیدہ وقفہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی، اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترقین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ اس کی قوت کار اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق باشر میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہونا چلا آ رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمایندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک داعی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیت پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے وہ رو بہ نازل تھیں یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پھیلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور آخرت فراموش مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کر لے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھاکے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں صاف صاف کہا تھا:۔

ما الفقر احشى عليكم ولكن احشى	مجھے تنہائے بائے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں
عليكم ان تبسط الدنيا عليكم كما	مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر اسی
بسطت على من كان قبلكم	کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی
فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم	تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع
كما اهلكتهم	کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کر دے جیسے
	انگوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ خلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے، جنہوں نے اپنی قوتِ ایمانی سوزِ دروں، نصیحت و تربیت و معظ
و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح پہنے سے بچایا، اور
خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انہوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے
نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا، جس میں محض ایک بے سیرت
بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلِ تائبین کی ایک سربراہ آوردہ جماعت
تھی جن میں سید بن جبیر، محمد بن سیرین اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۳۳۰ھ میں پیدا
ہوئے ان کے والد بسا مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور خود انھوں نے ام المومنین
ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات
میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت،
دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث
تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرام کا انھوں نے اچھا خاصا
زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ
میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے، یا صحابہ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا سازبان اور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔ وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا:۔

کان من دراسی النجوم علما وتقویٰ	وہ اپنے علم و تقویٰ زہد و ورع و استغفار و عالی ہمتی
و نہ ہدا و درسا و عفة و رقة و فقہا	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں
و معرفۃ مجمع مجلسہ ضر و با من الناس	ستارہ تھے ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
ہذا یاخذ عنہ الحدیث و هذا یلقن	تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث
منہ التاویل و هذا یسمع منہ المحلل	حاصل کر رہا ہے ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے ایک
و الحرام، و هذا یحکی لہ الفیاء و هذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتویٰ پوچھ رہا ہے
ینعلم الحکم و القضا، و هذا یسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
و ہونی جمیع ذلک کالیحی العجاج ند فقا	ہے کوئی وعظ سن رہا ہے اور وہ ایک ہجر زخار میں جو
و کالسراج الوہاج تالفا و لاتنس مواظقا	موجیں لے رہا ہے اور ایک روشن چراغ میں جو مجلس کو
و مشاہدہ فی الامر بالمعروف والنہی	پر نور کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

عن المنكر عند الامراء واشباه الامراء
سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے بڑے
بالکلام الفصل واللفظ الجزل۔
پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہار حق کے

واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ قال اور صاحبِ کمال نہ تھے بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے، ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے اسراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوفہ میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقہٴ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو کلام نبوت سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے "اجار العلوم" میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابہ کرامؓ کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا۔^۱

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو امتِ محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں کہ معظمہ ہمیشہ سے عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔^۲

حسن بصریؒ کے مواعظ

حسن بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیت الہی کی تعلیم، طول اہل اور فریب نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر بادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خش و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، انہی مشن کی ضرورت تھی، انھوں نے چونکہ صحابہ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب کچھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابہ کرام کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی و علمی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہل زمانہ پر تنبیہ، صحابہ کرام کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ہمات ہیہات اہلک الناس لامانی	ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وایمان	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا یقین، مالی اسی مرجا لا ولا اسی	مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے (صبر نہیں، ایمان ہے)
عقولا واسمع حییا ولا اسی انیسا	مگر یقین سے خالی آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر مانگنا یا
دخل القوم واللہ ثم خرجوا، وعرفوا	آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا ایسا نظر
ثم انکروا وحرمو انما استحلوا انما دین	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ اخل ہوئے اور پھر
احدکم لعنة علی سائنا اذا سئل المؤمن	نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، انھوں نے
انت بیوم الحساب؟ قال نعم کذب	پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیا ہے؟
وما لک یوم الدین ان من اخلاق	زبان کا ایک چٹخانہ! اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب

المؤمنین قوة فی دین و ایماناً فی یقین
 و علماً فی حلم و علماً یعلم و کیباً فی
 رفق و تملاً فی فاعة و قسداً فی غنی
 و شفقة فی نفقة و رحمة لمجهود و عطفاً
 فی الحقوق و انصافاً فی استقامة لا یحیف
 علی من یبغض و لا یأثم فی مساعدة من
 یحب و لا یزول لا یغتر و لا یلمز و لا یلغو
 و لا یلهو و لا یلعب و لا یشی بالنیمة
 و لا یتبع مالیس له و لا یجد الحق الذی
 علیه و لا یتجاوز فی العذر و لا یشمت
 بالقیعة ان حلت بغيره و لا یسر
 بالمعصية اذ انزلت بسواہ المؤمن
 فی الصلوة خاشع و الی الركوع مسارع
 قوله شفاء و صبره تقی و سکوتہ فکرہ
 و نظرنہ عبرة یخالط العلماء لیعلم
 و یکت بینہم لیسلم و یتکلم لیغتم
 ان احسن استیثروا ان اساء استغفر
 و ان عتب استعجب و ان سفہ علیہ
 حلم و ان ظلم صبر و ان حیر علیہ
 یرقین رکعتے ہو تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں قسم
 ہے روز جزا کے مالک کی غلط کیا مومن کی شان تو
 یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو صاحب ایمان یقین
 ہو اس کے علم کے لئے علم اور اس کے علم کے لئے علم بآپ
 زینت ہو عقلمند ہو لیکن نرم خواہ اس کی خوشبو
 اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے
 دولت ہو تو اعزاز کا واسن ہاتھ سے نہ چھوٹے
 پائے خراج کرنے میں شفیق خستہ حالوں کے حق میں
 رحیم و کریم حقوق کی ادائی میں کشادہ دست و فراخ دل
 انصاف میں سرگرم و ثابت قدم کسی سے نفرت ہو تو اس کے
 حق میں زیادتی نہ ہونے پائے کسی سے محبت ہو تو اس کی
 مدد میں حد شریعت سے بڑھنے پائے نہ عیب چینی کرتا ہو
 نہ طنز و اشارہ نہ طعن و تشنیع نہ لالینی سے اس کو کچھ کام
 ہو نہ لہو و لعب دھیمی چٹائی خوری نہیں کرتا جو اس کا حق
 نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا جو اس پر واجب آتا ہے
 اس کا انکار نہیں کرتا معذرت میں حد نہیں بڑھتا
 دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا دوسرے کی
 مصیبت کے اس کو مسرت نہیں ہوتی مومن کو نماز
 میں خشوع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے اس کا کلام

عدل ولا يتعوذ بغير الله ولا يستعين
 إلا بالله وقوله في الملاء، شكور في الخلا
 قانع بالرزق، حامد على الرخاء، صابر
 على البلاء ان جلس مع الغافلين كتب
 من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين
 كتب من المستغفرين، هكذا كان
 اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم،
 الاول فالاول حتى لعقوا بآله عروقل
 وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح
 وانما غيركم لما غيرتم ان الله لا يغير
 ما يقوم حتى يغير فاما يا نصيبهم واذا
 اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم
 من دونه من قال له

مہتابے ساتھ اپنا سارا بدل دیا۔ اِنَّ اللہَ لَا یَغۡیُرُ مَا یَقۡوِمُ
 شفا کا پیام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سرا سر
 غور و فکر اس کی نظر سراپا دس و عبرت علماء کی صحبت
 اختیار کرتا ہے علم کی خاطر خاموش رہتا ہے تو اس لئے گناہوں
 اور گزشتہ گھوٹا ہے بوشا تو اس لئے کچھ (ثواب) کئے
 اور نادمہ حاصل کرے نیکی کر کے اس کو خوشی ہوتی ہے غلطی
 ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے شکایت کرتا ہے اور اس کے
 دل پر کسی کی طرف سے رنج آتا ہے تو معافی طلب کر لیتا ہے اس
 کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے ظلم
 کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس حق میں نا انصافی
 کئے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی
 کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کو کسی بد نہیں چاہتا، مجمع
 میں باوقار تنہائی میں شکر گداز رزق پر قانع، آرام و عیش
 کے زمانہ میں شاکر، مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر
 غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شاغل
 یہی شان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے درجوں اور
 مرتبہ کے مطابق جب تک دنیا میں ہے اسی شان ہے اور جب
 دنیا سے گئے تو اسی آن بان سے گئے، مسلمانوں! تمہارے سلف صالحین کا
 نمونہ تھا جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا تو اللہ نے بھی

لوگوں کو اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالے تو جویر کرتا ہے تو پھر اس کے سامنے کوئی صورت ہی نہیں اور کوئی خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے اور سورہ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا:-

ان المؤمنین لما جاءتهم هذه الدعوة
من الله صدقوا بها واخضى يقينها الى
قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم
وابصارهم كنت والله اذ اسرايتهم
سرايت قومًا كانهم راى عين الله
ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم
جاءهم امر عن الله فصدقوا به فتحهم
الله فى القران احسن نعت قال وعلموا
الرخس الذين يمشون على الارض
هونًا واليهون فى كلام العرب اللين و
اللينه والوقار فاداخاطبهم الجاهلون
قالوا اسلامًا حليمًا ولا يعلمون وان
جهل عليهم علموا واصحابون
عباد الله نهاسهم بما يسمعون
ثم ذكرهم خير ليل فقال والذين
يبيئون لربهم سجدًا وقائمًا ينتصبون
الله على اقدامهم ويفترشون وجوههم

مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار
پہنچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی اور
اس پر ٹیک کہا، اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں
اتر گیا ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی
عظمت اور عظمت میں جھک گئیں، بخدا میں جب ان کو
دیکھتا تو مٹا سلوم ہوتا کہ دین حق اور غیب کی باتیں
گویا ان کی آنکھوں دیکھی تھیں۔ ان کو کثرت و جہا
اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز
پہنچی اور انھوں نے مان لی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید
میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ
چلتے ہیں، آیت میں "هونًا" کا لفظ آیا ہے، هون
کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں پھر
فرمایا اور جب ان سے مجھ لوگ بنا کریں تو کہتے ہیں سلام
ہے یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں، جہالت پر نہیں اترتے اور
اگر کوئی دوسرا جہالت پر اترے تو ان کے علم و وقار میں
فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کا

تَجِدُ الرِّبَّيْمَ تَجْرِي دُمُوعُهُمْ عَلَى
 خَدَّوَدِهِمْ فَرَقَامِنْ رِبِّهِمْ لَا مَرَمَا
 سَهْرُ وَالْيَلَمُ وَلَا مَرَمَا شَعْوَانُهُمْ
 قَالَ الَّذِينَ يَفْقَهُونَ رَبَّنَا أَصْرِفْ
 عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
 غَرَامًا وَكُلُّ شَيْءٍ يَصِيبُ ابْنَ آدَمَ ثُمَّ
 يَنْزِلُ عَنْهُ فَلَيْسَ بِغَرَامٍ إِنَّمَا الْغَرَامُ
 اللَّازِمُ لَهُ مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ
 صَدَقَ الْقَوْمُ وَاحِدُهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
 فَعْمَلُوا وَأَنْتُمْ تَمْنُونَ فَأَيَاكُمْ وَهَذِهِ
 الْأَمَانِي رَحِمَكُمُ اللَّهُ فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَعْطِ
 عَبْدًا أَبَاسِيَّةً شَيْئًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

بات سننے کے لئے دن گزاتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی
 راتیں گزرتی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ خود تشریف کرتا ہے اور
 وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدے میں ادا کھڑے ہو کر رات
 گزارتے ہیں واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے
 چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدے میں پڑ جاتے ان کے
 رخصاؤں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا خون ان کی
 آنکھوں کو اشکبار کھتا، آخر کوئی توبہ تھی جس کے لئے
 وہ راتیں آنکھوں میں کاتتے، کوئی توبہ تھی جس کا وہ
 دن میں سہے سہے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور وہ لوگ کہتے
 ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے بیشک
 اس کا عذاب بڑا تاوان اور بلا ہے جانے آیت میں غرام
 کا لفظ آیا ہے جو مصیبت انسان کو لاحق ہوا اور مل جائے
 اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت جو قیامت
 تک انسان کے سر سے نہ ملے قسم ہے اس خدا کی جس کو کوئی
 معبود نہیں یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں)
 سچے اور کچے ثابت ہوئے اور جو انھوں نے زبان کے کہا تھا
 اس پر عمل کیا لیکن افسوس تم صرف تناؤں میں مشغول ہو
 لوگو! ان خالی تناؤں سے باز آؤ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر موعظا کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحر علمی، اور تقریر و تاثر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفہ وقت یزید بن عبد الملک پر بر ملا تنقید کی، ایک موقع پر سر در کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید ابن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو، ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المومنین کا یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المومنین کا، ہاں نہ امیر المومنین کا، "حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی، خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الہی کے سامنے

انقیاد و تسلیم کی تو نہیں پیدا ہوئی تھی ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اغیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا یہی لوگ بالعموم زندگی پر جاؤ تھے درباروں میں حکومت میں کلیدی جگہوں پر فوج میں بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک قتی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذذب ہے اور کسی ایک کا وفادار اور غلصہ رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہو کفر ہے یا علانیہ اسلام ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔ ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے اس کی نفسی کیفیات اس کے اعمال و اخلاق اس کی اخلاقی کمزوری اس کی مصلحت شناسی موقع پرستی زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ دنیاوی انہماک آخرت فراموشی اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزوروں و غریبوں پر دست درازی منافقین اولین کی یاد آڑہ کرتی ہے۔

”نفاق“ و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر انداز اور سلطنت میں خیل ہیں، اور انہی سے شہروں کی چل پھل ہے کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی ”نفاق“ پایا جاتا ہے؟ فرمایا:-

لو خرجوا من ارض البصرة لا متواشتم
اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا

شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

۲۲

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت کے آراستہ نہیں ایک دوسرے کے موقع پر انھوں نے فرمایا:-

يا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من
خدا کی شان ہے اس است پر کیسے کیسے منافق

منافق قہر ہوا و استأثر علیہا۔
غالب آگے ہیں جو پرے درجہ کے خود غرض ہیں۔

۱۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص

زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانہ رسالت کے

بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق کثیر الوقوع ہے وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق

بکثرت موجود ہے، فوز الکبیر میں ارشاد فرماتے ہیں: ”اگر خواہی کہ از منافقان نمونہ بینی رود مجلس امرا و مصاحبان ایشان را ببین کہ مرضی ایشان

را بر مرضی شایع ترجیح می دهند اور انصاف بیچ فرق نیست در میان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے واسطہ شیعہ نفاق

در زیدند و در میان آنانکہ احوال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شایع معلوم کردہ اند بعد از ان برائت خلافت آن اقدام می نمایند و علی

ہذا القیاس جماعۃ از معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند معادرا نیاسنیا ساختہ اند نمونہ آن گروہ اند (۱۲ مطبع محمدی)

۲۔ صفت النفاق و ذم المنافقین، مولفہ محدث البکر فریابی ص ۶۱ ۳۵ ایضاً ص ۵۵

یعنی حکومت میں وہ غرض موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور نافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصری کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں میں بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ نفاق کی حقیقت بیان کرتے تھے، اور نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے، اوزیہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے، اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے، اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے، اور مترقبین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت ان کے مواظبا اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پھیلی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی مینے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے صلاوت ایمان اور حقیقت اسلام نصیب ہوئی، عوام بن خوشب کہتے ہیں کہ حسنؒ نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے۔

حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا، اللہ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشالیت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی تھی۔

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے "دعوت الی اللہ" دعوت آخرت اور دعوت ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بچے بغداد دارا خلافت اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرافت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندہ بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

لے بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا، اور خلافت کے پایۂ تخت دمشق کے بعد اسلامی مملکت میں دوسرا درجہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
 لے بن خلکان (حسن بصری)

واقعہ کر بلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی سیدنا حسین (علیہ علیہ السلام) کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن حسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا، اور ۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے، امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے، اور حاضر نہ ہو سکے پر معذرت کی، ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (بن عبداللہ المحض ابن الحسن المثنی بن سیدنا حسن بن علی) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی، اول الذکر رمضان ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظر قائم کر دی، اگرچہ علماء وہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر قربانی، اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جوان مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ“

۱۔ مناقب ابی حنیفہ بزار ص ۱۵۵

۲۔ امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۱۴)۔
۳۔ مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی، اس کی وجہ ان کا عہدہ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو امام ابوحنیفہ

کی سیاسی زندگی، از مولانا سیدنا غلام حسن گیلانی۔

خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکرہ

خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافت عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیا داری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سونٹکی میں عربی روح کا فرما تھی، اس کی خرابیاں، اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی، اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و جیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:۔

امطری حیث شئت فسیا تیخی جہاں تیرے جی میں آئے جا کر برس جاتی رہی پیداوار

خراج جلد۔ کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنت عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں ست ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ۳۱۵) سالانہ سے زائد، جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، مامون کے زمانہ میں اس میں

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان پیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہل کمال، صنائع و معنی، غلام، باتدیاں، مصاحب شاعر اور خوش باش و خوش فکر سمیت کہ بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور تمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دارالسلام یا مرکز اسلام میں شروع ہو گئی تھیں، دولت کی بہتات مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و عیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:-

"مامون مع خاندان شاہی و ارباب دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی رزکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے ہمائداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کر لی، خاندان ہاشم و افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر رشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں، جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، الماک، خلعت، اسب خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا، جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہوا اسی وقت وکیل الخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر رشک و عنبر کی گولیاں اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف قرش بچایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کئے گئے، ہوزرین قرش پر کبھر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے پلے

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش و عشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھیں، جو دعوت الی اللہ، تزکیہ نفوس، علوم دینیہ

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کیوان (جاخط) ج ۳ ص ۹۱، وج ۵ ص ۱۱۵ و مجلدات الاغانی۔

۲۔ المامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم ص ۱۵۷، بحوالہ ابن خلدون، ابو الفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں ہر تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دیکھیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اس امت کی روح اور تعلق بشر کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن و حدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر ملاطمہ سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی و پرعشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی، جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ رقبہ میں مقیم تھا کہ شہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کینز بالا خانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ ماجر کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ بادشاہی نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم و عمل و اصلاح و تقویٰ اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صالحی و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت میں دین و اصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے

اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، حذیفہ بغدادی

معروف کرخی، اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغناء، ایثار و بے نفسی، بے ترغیب خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی و فارقائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے۔



تدوین حدیث وفقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے اس وقت دو بڑے عظیم (ایشیا و افریقہ) اور بڑے عظیم یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج، محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جاسکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ وہ ہوتا، جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافلین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت محروم کر دیتی تھی۔

ع یک خطہ غافل بودم صد سالہ را ہم دور شد

اس وقت دوسلوں کی طرف قوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے، جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچے کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے وہ زمانہ، نبوت کے تیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت، زہد و تقویٰ اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور انتظام و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بے متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجہاتی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

۱۔ حدیث کے جمع و تدوین کا کام حمد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی توجہ و محنت کا حال گزر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) ابن جریر (م ۱۵۰ھ) ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) سید ابن ابی عروبہ مدنی (م ۱۵۶ھ) عمریمینی (م ۱۵۳ھ) ربیع بن صلیح (م ۱۶۰ھ) وغیرہ کی مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

تذوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہور اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوت حفاظت میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابہ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اس کو محفوظ کر لیا، اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل و عادات کا ایسا جتنا جاگزا مرقع پیش کر دیا جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صد ہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پر جوش طالب علم مہیا کر دیئے، جو قوت حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کوئی کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمالی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے ۴۰ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انھوں نے گھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پاٹے کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث اندلس ابن حیوان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی گویا فتح سے لے کر سونہ تک سارا بڑا عظیم افریقہ اور پھر بحر احمر طے کیا بہتے محدثین کا سفر نامہ یمن میں بڑا عظیموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے، اس وقت کی تمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر بھرنا تو معمولی بات تھی۔

فن اسما الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی، اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہنچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق ”وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ“ کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی اور اس سلسلہ روایت کے ایک ناقل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم ”اسما الرجال“ کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے، اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے ”الاصابة في احوال الصحابة“ (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسما

الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم

ہو سکتا ہو۔“

۱۔ یہ مثالیں علامہ سلفؒ (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، کن کا عنوان ”سفر“

۲۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء ۱۸۶۳ء سلسلہ خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی۔

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی، اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور قہرسم کی معلومات یکجا کر دیئے، اور ان کے بارہ میں کسی روایت سے کام نہیں لیا، خواہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

• راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعتاً آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی، اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام دکن بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانیچی تھے، اس بنا پر وہ خود ان کے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے؟

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی، یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے صرف اس معاوضہ میں پیش کرتے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (مدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا، کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں ہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ نام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے لیے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سٹو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدندان رہ گئے۔

مجالس درس میں سائیں کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس و روایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور ان کے رفت سے تلمذ و استفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا۔ یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا، تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی المائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چوڑے پر مٹھے تھے، خلیفہ معتمد بالشر نے ایک بار اپنا ایک محمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رجبہ عثمان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، اس تکلی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا، اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواؤں کا شمار کیا تو کچھ اور چالیس ہزار دوا میں شمار ہوئے جو لوگ لکھتے نہ تھے، صرف سامعاً شریک تھے، وہ اس تعداد سے خارج ہیں، شیخ وقت قریابی نے بغداد میں المائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے، اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار قریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے، جو درو قلم لے کر بیٹھے، فریبری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ہزار آدمیوں نے سنا۔

صحاح ستہ

یہ عمومی ذوق انہماک اور جذبہ ہر باقت خالی از حکمت نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ و مستند سرمایہ جمع ہو گیا، جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح و تجدید کا ایک بڑا طاقت ور

ذریعہ ہے اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح بخاری امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع امام ابو داؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد امام نسائی اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وقیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس عملی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین مسائل کا استنباط و استخراج جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل موخر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسلام جزیرۃ العرب کے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ اوصیاء کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

لے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف کیا ہے "اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہما من المنقول المرفوع صحیح بالقطع وانہما متواتران الی مصنیفہما وانہ کل من یروی امرہما یمتدع متبع غیر سبیل الموضوع" (۱) امتنا یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں قطعی متصل مرفوع روایات ہیں، وہ قطعی طور پر صحیح ہیں اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی تواتر سے ثابت ہے، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہے وہ جحد اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہے۔

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کا عظیم کئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۴۰ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے اپنے تعلق باللہ، تلہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو دوبار عہدہ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوٹے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تین تنہا حکومت وقت کے رجمان اور اس کے سرکاری مسلک کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک و راہی سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تین تنہا انتہا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے جن میں سے اڑتیس ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار معاملات سے۔

۱۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ ۲۔ فقہ الاسلام (ج ۱، ص ۱۷۹) ج ۲ ص ۱۸۰

شمس الائمہ کروری نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب لام جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے ابو بکر خلیل (م ۳۳۵) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے۔

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے متنازلے جنہوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنہوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبداللہ بن وہب، عبدالرحمن ابن القاسم، اشہب بن عبدالعزیز، عبداللہ ابن عبدالحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا، امام شافعی کو بولطی، مزنی اور ربیع جیسے مخلص اور ذہین شاگرد ملے جنہوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کر دیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المعنی جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فہن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی

لذی سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ علماء عقودا تحقیقان۔ ۲۵۵ اس کتاب کا نام ”جامع العلوم لام احمد“ ہے

ابو بکر خلیل کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۳۳۲ میں ملاحظہ ہو۔

زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی فتنی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی، جس کی قوتیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے۔



فتنہ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفۃ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا یہ فلسفہ محض چند خیالات قیاس کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص تصور اور تجربات وابستہ ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں، الشکر ہی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسئلہ کیمیاء کی طرز کی تحلیل و تجزیہ اور علمی مونثکافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جاسکے اس بارہ میں انسانوں کا ذریعہ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الہی ہے اسی اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے اور اسی پر انکشاف کرنا عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم حکم موجود تھا، اور ان کو اس نقل بہ حال (الہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ دین اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوت اسلام، فتح و جہاد اور زندگی کے علمی مسائل اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی، جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاف ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی تھی

زیادہ سطحیت اور جہد تھی اس طرز فکر اور طریقہ بحث سے متاثر ہوئے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق، کلام الہی، رویت باری، مسئلہ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوت عمل کے لئے مضر۔

معترکہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معترکہ کر رہے تھے، جو اپنے وقت کے ”روشن خیال“ عالم اور پر جوش منکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء کا گروہ تھا، جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موثر گائیوں کو معتر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دور خلافت تک معترکہ کو عروج حاصل نہیں ہوا، مامون کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معترکہ سے ملتی جلتی تھی، معترکہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی دؤاد کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا تھا، اور معترکہ کے افکار و آراء کا پر جوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومت وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، مامون میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبہ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نو جوانوں کی عجلت پسندی اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد (راج ہسٹ) دونوں جمع تھیں، اس کے دربار اور مزاج پر معترکہ حاوی تھے۔

اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی تفصیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی برپا پیدا ہوئی، ایک مرتبہ متوہ کے جواز کا

اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے علیؑ پر اس کو قائل کیا تو اس کی حرمت کا اعلان کر دیا۔

عقیدہ خلق قرآنؑ اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور مد مقابل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبلؒ اس مسئلہ میں سید پر تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول ۱۶۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلہ ثقیف میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں، ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقہ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلائی تو وہ اس دعوت کے بہادروں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ماں نے بڑی ہمت اور وصلہ بندی سے پرورش کی، گذشتہ اوقات کے لئے برائے نام ایک جائیداد تھی، ان حالات نے ان میں تحمل و جفاکشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں، نجابت اور صلاحیت کے

لئے خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا دامنی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مومنین نے اعتراض کیا ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظاً و معنایاً کلام الہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا، محدثین حضرات کی ان تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے مضر سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادی آراء کا احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت غلو اور تندہی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے سکرام اسنام کو میدان جنگ اور دارالامتحان بنا دیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو قرون وسطیٰ میں ارباب کلیسا نے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہ سختی اور حکومت وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

۱۷۷ھ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار غنی بن حارثؒ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آٹار بچپن سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے قائلع نگار تھے، اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے، اور خبریں بھیجتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے کمسن بھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک معین شخص کو پہنچا دیں انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی، ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی غوریں جن کے شوہر مارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے، ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے، لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے، اس کو نہیں لکھتے تھے، تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت و نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (سلیم ابن جمیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا۔^۱

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابویوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث، سلیم ابن بشیر ابن ابو حازم الوسطی (م ۲۸۵ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثنا میں مشہور ائمہ حدیث عبدالرحمن بن مہدی، ابوبکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کی اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے، اور کچھ اجالا ہو جائے۔ بغداد سے قاغ ہو کر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۲۸۵ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی، جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدون کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعیؒ احادیث کے صحت و مستقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے تھے کہ اگر تم محدثین کے یہاں

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کروں اسی کو اختیار کروں گا۔

انہوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا، طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۸ھ میں انہوں نے حج کی نیت سے حجاز اور وہاں کچھ دن قیام کر کے عبد الرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء یمن کا قصد کیا تھا، اور اپنے ہم درس یحییٰ بن عیینہ سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی اور کہہ پونچے، ابھی دونوں طواف قدوم کر رہے تھے کہ عبد الرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن عیینہ ان کو پہچانتے تھے، انہوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انہوں نے ان کو دعادی اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن عیینہ نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمد نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انہوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک مہینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک مہینہ اور مصارف کثیر سے بچالیا، اور شیخ کو ہمیں پہونچا دیا، امام احمد نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسخ کر دوں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور زہری اور ابن السیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انہوں نے وہاں سماعت کی۔

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوت حافظہ کا نتیجہ تھا، کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعت علم اور کثرت حفظ کے باوجود وہ امام شافعی کے تفقہ حسن استنباط اور زکاوت سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ مدارات عینای مثلہ انہوں نے ان سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس کا ملکہ اخذ کیا اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے (امام شافعی بھی

لے ابن کثیر اور ابن جوزی۔

ان کے بڑے معترف اور قدرواں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقى واقفه من ابي حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)۔

چالیس سال کا عمر میں غالباً ۲۵ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کر سکتا تھا، غریب کو امراء اور اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہم عصر کا بیان نقل کرتے ہیں:-

لم ارالفقیر فی مجلس اعوفنا فی مجلس	میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلس درس
الی عبد اللہ کان مائلاً الیہم مقصراً	میں معزز دیکھا کہیں نہیں دیکھا وہ غریب کی طرف توجہ
عن اهل الدنيا، وكان فيه حلم ولم	بہتے تھے اور امراء سے بے رنجی برتنے تھے ان میں حلم و
یکن بالعجول، وكان كثير التواضع	وقار تھا ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی بڑے متواضع
تعلو السکينة والوقار اذا جلس فی	اور اگر المزاج تھے طماننت اور وقار ان کے چہرہ سے
مجلسه فلما بعد العصر لا يتکلم حتى یسأل	عیاں تھا عصر کے بعد جب درس کے لئے بیٹھے تو جب تک
	ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمہ سلف کی طرح فقرو زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی اور ان کا فقر اختیار

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطین وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مال حلال ہے اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کر کے یا اپنی آبائی جائیداد کی آمدنی سے گزارا کرتے تھے، اس فقر و تنگی کے باوجود بڑے قیام اور عالی حوصلہ تھے، قرآن تھے، اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو نہایت ہوائی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کر چکا تھا، انھوں نے فتنہ خلق قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہنچی تھی، معاف کر دیا، فرماتے تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرمانے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و اوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں :-

ما رأیت مثل احمد بن حنبل صحیفۃً میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس

بصحبہ سنۃ ما افتخر علینا شیئاً ما کا ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے

فیہ من الصلاح - الخ - اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اخلاص کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے اور یہ اس دور میں بڑا سرمایہ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عام ابوالنعمان سے

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا، اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے،

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبد اللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب میں انھوں نے جواب دیا: یا ابا النعمان نفعی مما سألک (ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں؟ ہیں ان سے بہت پوچھتا رہا، مگر انھوں نے مال دیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فقہ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا، اور ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے، اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ میں استدراج نہ ہو، کیوں تم نے یہ کیسے کہا؟ میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم ملک دم میں جہاد کر رہے تھے، رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور ہوا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد کے لئے دعا کرو! ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجیق بھی چلاتے تھے، اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا، اور سپر کو بالکل آڑ بنا لے ہوئے تھا، ہم نے احمد کی نیت کر کے منجیق چلائی، اس کا سر اور سپر اڑ گئی، یہ سن کر امام احمد کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو!

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزو مند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیا اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی کچھ کہے، اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو اضع اور مسکنت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور فوجی اور سپاہی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

لے خدا کی طرف سے ڈھیل اور کسی غیر مقبول اور فاسد العقیدہ آدمی کی کرامت اور وجاہت کا بطور صلہ ترحمۃ الامام احمد (رحمۃ اللہ علیہ)

میں اسحاق بن ابراہیم (نائب بغداد) اور فلاں فلاں حکام کے پاس گیا ہوں، لیکن میں نے احمد بن حنبل سے زیادہ بارعب کسی کو نہیں دیکھا، میں ان سے ایک مسلم گفتگو کرنے گیا، مجھ پر ان کی اہمیت سے لرزہ طاری ہو گیا، ان کے زمانہ کے تمام اہل قلوب اور اہل خلوص ان کی عظمت کے قائل اور ان کا ادب کرتے تھے، علماء وقت اور ائمہ افن ان کے تبحر و وسعت علم کے معترف اور اس سے متعجب ہیں، مشہور محدث ابراہیم اکبر لکھتے ہیں:-

رأيت احمد بن حنبل خرايت كان الله
جمع له علم الاولين والآخرين من كل
صنف يقول ما شاء ويملك
ما شاء.

میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا ایسا مسلم ہوتا تھا کہ
اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں اگلوں پھلوں کا ہر قسم کا علم
جس کو دیا ہے جس کا چاہتے ہیں اظہار کرتے ہیں اور جس کو
چاہتے ہیں اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

امام احمد کا زہد ضرب المثل تھا، مامون، معتصم اور واثق کا دوران کے لئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ تینوں ان کے درپے آزار تھے، متوکل کا دور اس لئے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا عقیدت مند اور ذہانت قدر داں تھا، ان کو اس دور کی آزمائش زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی، اور اس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کی ایذا و تعذیب کے باوجود میرا دین سلامت رہا، اب اس بڑھاپے میں اس دوسری آزمائش میں مبتلا ہوں، لیکن جس طرح معتصم کے تازیانے ان کے اعتصام بالسنۃ اور استقامت میں فرق نہ پیدا کر سکے، اسی طرح متوکل کی عقیدت مندی ان کے استغناء و توکل میں تغیر نہ پیدا کر سکی، ایک مرتبہ متوکل نے ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خیر پر رکھ کر لائی گئی تھی، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے حاجت نہیں لانے والے نے کہا کہ آپ کو واپس کرنا مناسب نہیں، بڑی مشکل سے خلیفہ کا دل صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی ہو جائے گی، انھوں نے ایک جگہ ڈلوادی، آدھی رات کو انھوں نے اپنے چچا کو بلوایا، اور کہا کہ مجھے اس تھیلی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی، میں یہ لے کر بڑا پشیمان اور پریشان ہوں، انھوں نے کہا کہ اس وقت تو آدھی رات ہے، لوگ غافل

۱۔ مناقب ابن جوزی، مناقب حافظ ذہبی، طبقات ابن السکلی۔

سورہ ہیں، صبح جیسا آپ کی سمجھ میں آئے کیجئے گا، صبح ہی انھوں نے بعض مستند اور بعض واقف کار لوگوں کو بلایا، اور ان لوگوں کی فہرست تیار کروائی جو صبح اور مستور الحال تھے، اور مال تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تھیلی میں ایک درہم بھی نہیں بچا، پھر تھیلی بھی ایک مسکین کو خیرات کر دی۔

انھوں نے متوکل کے حکم و اصرار سے کچھ روز اس کی لشکر گاہ میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ ان کے لئے بڑی تکلف کھانا آتا تھا، جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس درہم روزانہ ہے، انھوں نے اس کھانے کو کسی وز چھانک نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے رہے، آٹھ روز انھوں نے روزہ پر روزہ رکھا یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو ان کی زندگی شکل تھی، ان کے صاحبزادہ عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد لشکر گاہ میں سولہ روز رہے، انھوں نے اس عرصہ میں ایک چوتھائی ستو کھایا ہوگا، ان کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، متوکل کے اصرار سے ان کے صاحبزادوں کے لئے شاہی رقم مقرر ہو گئی تھی، ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے تو ہمارے یہاں سے وہ کوئی چیز استعمال کے لئے منگوا بھی لیتے تھے لیکن جب شاہی رقم ہمارے گھر آنے لگی، انھوں نے پلسلہ بالکل بند کر دیا، ایک مرتبہ طبیب نے ان کے لئے ایک بھنے ہوئے کدو کا پانی تجویز کیا، لوگوں نے کہا کہ اس کو صبح (امام احمد کے صاحبزادہ) کے تنور میں پکا لو، وہ ابھی گرم ہے، انھوں نے منع فرمایا، آخر میں ان کو خود اپنی احتیاد بھی کافی نہ معلوم ہوئی، صبح کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ صبح! میرا جی چاہتا ہے کہ تم اس عطیہ شاہی کو چھوڑ ہی دو، اس لئے کہ یہ تم کو میرے سبب سے ملتا ہے۔

۷ سال کی عمر ہوئی تھی کہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ فوج در فوج داخل ہوتے تھے اور گھر بھر جاتا تھا، جب وہ چلے جاتے تو دوسرا نبوہ آتا، سڑک آدمیوں سے بھر جاتی تھی ۹ روز وہ بیمار رہے، ہجوم بڑھتا جاتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازہ پر اور گلی میں پولیس کا پہرہ لگایا

اور وقائع نگار متعین کر دیے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیعت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمہرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔^{۳۵}

فتنہ خلق قرآن

مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی،^{۳۶} اس نے والی بغداد اسحق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامہ مسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے۔^{۳۷}

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاة کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو، اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

۳۵ ذہبی ص ۷۷ ۳۶ بخاری تاریخ کبیر و صغیر ۳۷ جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳۸ اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور طبریور کی تاریخ بغداد میں موجود ہے۔

سرگروہ میں اس کے پاس بھیج دیا جائے وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انھوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔ انتقال سے پہلے مامون نے اسحق بن ابراہیم کو میسر افران بھیجا جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکاران سلطنت اور اہل علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور شاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برا فروختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو، اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ بقیہ تیس علماء میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، قواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور میرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے جن کو مامون کے پاس طوس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علماء تھے، جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رتہ ہی پہنچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہنچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتمد بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسيرة اخيك في القرآن) اور قاضی ابن ابی دؤاد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنائے رہے، چنانچہ معتمد نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں

اب مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت اور عقیدہ صحیحہ کی حمایت اور حکومت وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو رقعہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے چوتھے دن والی بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد انہم کو اپنی زندگی ایسی دو بھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا، اس کے بعد امام کو معصوم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۸۰ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر وہ سر جلا دے لایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:۔

اعطونی شیئا من کتاب اللہ اوستة میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی

رسولہ حتی اقول بہ سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

”میں جب اس مقام پر پہنچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بوہل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معصوم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، اسی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے سج کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معتم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معتم بیٹھا ہوا تھا، قاصد القضاۃ ابن ابی ذؤاد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابو عبد الرحمن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابو عبد الرحمن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے سج کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی ذؤاد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے، اور یہ نقد کی تحقیق کر رہا ہے، معتم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیٹریوں سے تھک گیا تھا، اور بو جھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہ میں نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی شہادت کی طرف، میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جد امجد ابن عباس کی روایت ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا انھیں معلوم ہے کہ ایمان کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اور مال غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکالنا، اس پر معتم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبد الرحمن بن اسحاق کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبد الرحمن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرنے ہیں) :-

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معصم کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو؟ میں کہتا امیر المؤمنین! مجھے کتاب الشریاست رسول میں کچھ دکھائیے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معصم کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کر لیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کر دوں، اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو؟ میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب الشریاست رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اکتا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا، یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اکتا گیا تو کہا کہ ان کو لے جاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر ہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا، اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پاؤں میں پھر ڈال لیا کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں پرہیز ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف دیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا اگلے بڑے کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معصم کے پاس پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ، پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بلایا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات ان لوگوں میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا، میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا کہ ان کو کچھ واؤ!

معصم امام احمد کے معاملہ میں نرم ہو گیا تھا، مگر احمد بن قواد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معصم اپنے بھائی مامون کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچو، اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، مقتسم کرسی پر بیٹھ گیا، اور جلا دوں اور تازا زیانہ لگانے والوں کو بلایا، جلا دوں سے کہا آگے بڑھو، ایک آدمی آگے بڑھا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، مقتسم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس کوڑوں کے بعد پھر مقتسم میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجیب مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھیڑتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیر المومنین آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، مقتسم پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلا دوں کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اشار میں میرے حواس جاتے رہے جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بڑیاں کھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرا دیا، تم کو روندنا احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا!

بے نظیر عزیمت و استقامت

اس کے بعد احمد بن خلیل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک ٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گزرے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو پارسوں میں تھا، کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل کھلی کی سی تھی۔ محمد بن اسمعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھا، بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

ہے لیکن انھوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا آپ کے سامنے برف کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پیے واپس کر دیا۔

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے، ابوالعباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقبہ میں محسوس تھے تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں انھوں نے فرمایا کہ کتاب کی حدیث کا کیا جواب ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر پر آرا رکھ کر صلا دیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹتے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے

امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلاء میں حکومت و وقت کا ساتھ دیا تھا، اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دو بالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قیدیہ کا مقلوبہ ہے کہ:-

اذا رأيت الرجل يحب احمد بن

جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے

حنبل فاعلم انه صاحب سنة

محبت ہے تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا تابع ہے۔

۱۔ تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ۵۰۰-۴۹۹ باختصار وتلخیص۔

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من معتموداً یذکر احمد بن حنبل جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو

بسوء فاتھمولا علی الا سلام۔ اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

امام احمد حدیث میں امام وقت تھے، سند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت اس فتنہ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کاتھما مقابلہ تھا یہی ان کی قبول عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازہ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست

مشہور شد ازاں کہ در آتش نگوشت

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے، اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہم عصر اور ہم استاد مشہور محدث وقت علی بن المدینی (جو امام بخاری کے مایہ ناز استاد ہیں) کا ارشاد ہے:-

ان الله اعز هذا الدين بسجلين الشرفاء في اس دين كالعبد وحفاظت

لیس لهم ثالث، ابوبکر و صدیق کاکام دو شخصوں سے یا ہے جن کا کوئی تیسرا ہم

یوم الردۃ و احمد بن حنبل یوم المنة نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر ابوبکر صدیق

اور فقہ اخلق قرآن کے سلسلہ میں احمد بن حنبل۔

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب اس امام سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر
امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، نماز جنازہ
پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں۔



فتنہ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

معتصم اور والفق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، والفق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے سیراز اور معتزلہ کا دشمن تھا اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت و اقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بیدخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا، خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا، اور قضا، افتاء و حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے، تیسری صدی کے وسط میں ان کا خا صاً دور دورہ ہو گیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں، اور ان کی آراء و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے، امام احمد کے بعد خا بلہ میں کوئی طاقت ور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقہ بحث و نظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی، نتیجہ یہ نکلا کہ مباحثہ کی مجلسوں

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی علمی کمزوری اور فلسفہ کے بادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پورا بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطلی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر حاضر جوابی اور علمی موٹنگانی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے اور معتزلہ کی عقلیت اور فلسفہ سے مرعوب ہو رہے تھے، یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام، ان فلسفی ثمانظرین کے لئے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطلی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی، اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے زوہدین و خالصہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحصال۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نور درہ چکا ہو جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے پست و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پست قد انسان اور نو عمر بچے اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابو الحسن اشعری

ابو الحسن علی نام، والد کا نام اسمعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے،
 ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمعیل کے انتقال کے بعد ابو علی الجبائی
 سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابو الحسن نے ان کی
 آغوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتد اور دست راست بن گئے، ابو علی جبائی اچھے مدرس
 اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابو الحسن اشعری شروع سے زبان آور حاضر جواب
 تھے، ابو علی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سر حلقہ اور مجالس بحث کے
 صدر نشین بن گئے، تمام ظاہری قیاسات و قرائن بتلاتے تھے کہ وہ اپنے مربی اور ائمہ کے جانشین ہوں گے
 اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے
 انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری
 زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزاری تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی سند امامت تیار تھی، شیخ
 ابو الحسن کی طبیعت میں اعتزال کا رد عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے
 متفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں، اور اپنے مذہب کی کچھ ہے
 حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر
 جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد
 ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن
 وہ گھر سے نہیں نکلے، سو لہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہنچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

بھری ہوئی تھی انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے، وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت، علمی تحریق و قوت گویائی اور استدلال تحریر اعتزال کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہل سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا دلیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔

امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان کو کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکم شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

صلاحیت تھی، مذہب حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلادیا وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات و علم و کلام میں مجتہدانہ داغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہنہ مشق استاد اور ماہر فن، مبتدی طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبد اللہ بن خلیفہ اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں :-

”میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابو الحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کر لی، تو ابو الحسن اشعری نے گفتگو شروع کی، انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں (کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں) وہ یس کر سنس دیئے“

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ ”آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداء خاموش کیوں رہتے ہیں“ اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں، اور اعتراضات کو خود دفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہل حق کا فرض ہو جاتا ہے“

امام ابوالحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد تکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوت تحریر کی وجہ سے "سان الائمہ" کا خطاب دیا تھا کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابوالحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ میری ہی سعادت ہے کہ میں ابوالحسن کے کلام کو سمجھ لوں۔

علامہ ابوالفتح اسفہانی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابوالحسن باہلی (امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا، جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابوالحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابوالحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی، جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ۔

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور نہ بعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات پاری تنائی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ وہ بعض پر جوش محدثین و خابہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقولہم" اس میں

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلا کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے۔
 ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم
 میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا اخذ نہیں
 بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، نے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی۔
 ”کتاب الابانۃ من اصول الدیانۃ“ میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے،
 تحریر فرماتے ہیں:-

آقبا بعد اخات من الزائغین عن الحق	حمد و سلاوة کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة و اهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
اهواهم الى تقليد رؤسائهم و من مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من اسلافهم فتا و لو القوا ان على اراؤهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تا و لا لم ينزل الله به سلطانا و لا و ضم	ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهان و لا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
مر ب العالمين ولا عن السلف	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين ^۱	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:-

قولنا الذي نقول به ودياننا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها القسك بكتاب ربنا عز وجل	جس پر ہم قائم ہیں۔ ہے کہ قرآن مجید اور سنت
و سنة نبينا عليه السلام و ما روي	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین

۱۔ کتاب الابانۃ من اصول الدیانۃ ص ۵، طبع دائرة المعارف حیدرآباد۔

عن السجادة والتابعين وإمامة الهدى
 وعن بدلك معتمدين وبما كان
 يقول به أبو عبد الله أحمد بن محمد
 بن حنبل نصر الله وجهه ورفع ريقه
 واجزل شوبته قائلون ولما قال
 قوله مخالفون لآله الإمام الفاضل
 والرئيس الكامل الذي أبان الله
 به الحق ورفع به الضلال وأوضح
 به المنهاج وقمع به يدع المتدعين
 وزبح الرائيين وشك الشاكين فرحة
 الله عليه من إمام مقدم وخليل
 معظم مخم

اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار
 کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور
 امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (اللہ ان
 کے پیارے کو تر تازہ رکھے اور ان کے درجات
 بلند فرمائے اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل
 و متقدمین اور جوان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم
 اس سے علیحدہ ہیں اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل
 اور پیشوائے کامل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
 ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور
 صراطِ مستقیم کو روشن کیا اور متبدعین کی بدعات
 اہل زینہ کی کجروی اور اہل شک کے شکوک کا ازالہ
 کیا اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق
 محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنت اور عقیدہٴ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی
 تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور عام خالہ گری رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و
 سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور معتزلہ اور دوسرے
 فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد
 اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم اشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور آخرت فرقوں کے "معتوب" بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد خیالہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور عقلی مباحث و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک "زیغ و ضلال" کی بات تھی۔

امام ابو الحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الہیات و مابعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کا ہم کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیمات نبوت ہے، نہ کہ عقل مجردہ اور قیاسات یا یونانی الہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلافات سے عقائد کے بارے میں جو مسائل پھڑکے ہیں اور ان کی بنیاد پر متقل کر وہ اور فرقے بن گئے ہیں، ان سے صرف اسی بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے، ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہونچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، نیز فرق باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود الہی سنت کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی و نبوت محمدی ہے، اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے اقوال و روایات ہیں، اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، ایک ان حقائق و عقائد کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حیات سے ہے، اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خواہ مخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے، اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابو الحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں، شریعت کے ویل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی و حسی حیثیت سے

ان کی تردید اور اہل حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سکوت کی وجہ لاعلمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرز استدلال پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فقہوں اور احکام و بے علمی کے حلوں سے بچا لیا، اسی طرح محافظین شریعت اور تکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت و مدلل کریں، امام ابو الحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کر کے لے ایک مستقل رسالہ استحسان الخوض فی الکلام تصنیف کیا۔

بہر حال انھوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور ناراضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرز عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً و تحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جادیا، عقائد اہل سنت اور طریقت سلف کی طرف سے پُر زور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہل سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی، اور وہ احساس کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سواد امت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے پے درپے حملوں سے پیچھے ہٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہو گئی، ابو بکر بن العسیری کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اشرعائے امام ابو الحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجدد دین و محافظین سنت میں شمار کیا ہے، اور ابو بکر اسماعیلی جیسے بعض اہل نظر

نے تجدید دین اور حفاظت شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔

ان کی تصنیفات

امام ابوالحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور زبانی تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقائد باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس اجزاء میں ہے، بعض مؤلفین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب اویان و فرق کی تردید میں، ان میں ایک کتاب الفصول ہے، جس میں انھوں نے فلاسفہ طباہین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے، ابن خلکان نے کتاب "اللمع" "الموجز" "البصاح البرہان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الافک والتفصیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ و کلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے کتاب القیاس، کتاب الاجہاد، خبر الواحد، ابن الراوندی کے انکار، تواتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۸۰ کتابیں ہیں جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں، مقالات کلامیہ (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں منزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں، ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اور

خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

عبادت و تقویٰ

امام ابوالحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجہ امامت و اجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق قاضیہ سے بھی آراستہ تھے اور بہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوالحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امور آخرت میں مستعد نہیں دیکھا، تکلم ابوالحسن ہر وی بیان کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پر تھیں، ان کے خادم بندار بن احسین کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن صرف ایک جائیداد پر گزار کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقت کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔

وفات

۳۲۲ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الزوایا میں مدفون ہوئے، ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

امام ابو منصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیا سے اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

۱۔ شہر مشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں ص ۱۲۱ پر اور بہتر مقالات اسلامی کے

مقدم میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابوالحسن) ۲۔ تبیین کذب المفتری ص ۱۴۱ ۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً ص ۱۴۲ و ابن خلکان ص ۳۶۵ بخوارزمی ص ۵۵ ابن خلکان ص ۳۶۴۔

مشکلم ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف توجہ کی، وہ بڑے متوازن دماغ کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابو منصور نے حشو و زوائد ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نباشنا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابو منصور اور ان کے قبیحین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدی نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے، ان میں چالیس سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء و تکلمین عقیدہ و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء و تکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابو منصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تأویلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت، علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالم اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علم کلام لے یہ زمانہ اعتزال کے خلاف ردِ عمل اور سنی علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابوالحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۲۱ھ) اور سمرقند میں امام ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں نامور معاصرین کے مقابلہ میں علم کلام میں شہرت حاصل نہیں کی، اور امام ابو منصور ماتریدی کا مدرسہ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ ۲۷ عقائد ضدیہ کے تعلقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل تیس سے

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتب خیال میں بڑے جلیل القدر علماء و متکلمین اور اساتذہ پیدا ہوئے جنہوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا، اور ان کی وجہ سے دنیا بے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معتزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علماء اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۳۷۵ھ) اور شیخ ابوالسحق اشعری (م ۴۱۵ھ) بڑے نامور متکلم اور با عظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابوالسحق شیرازی متوفی ۴۸۵ھ اور امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجونی (م ۵۶۵ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابوالسحق شیرازی مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی باشر نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہنچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے نکل آتا، ہوش عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامان تجارت ان پر تیار کرتے، مٹھائیوں، پھلوں قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام الحرمین ان کا غاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔

الپ ارسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام الحرمین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگراں اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے، ابن خلدون لکھتے ہیں :-

وَبَقِيَ عَلَى ذَلِكَ قَرِيبًا مِائَتَيْنِ سَنَةً تِسْعِينَ سَالًا تَحْدِثُ فِيهِ طَرَحٌ رَاسِيٌّ عِلْمِيٌّ وَدِينِيٌّ
 غَيْرُ مَزَاحِمٍ وَلَا مَذَافِعٍ مُسَلَّمَةٍ لِمُعَرَّابٍ مِيدَانٌ فِيهِ انْكَاسُ كَوْنِيٍّ مُسَرَّوْرٍ لَيْفٌ تَهْتَاجُ
 وَالْمَنْبَرُ وَالْمُخَاطَبَةُ وَالتَّدْرِيسُ وَمَجْلِسُ وَمَنْبَرُكَ وَهَذَا زِينَتُهُ خُطَابٌ تَدْرِيسٌ أَوْ رَوْعٌ
 التَّذْكِيرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۝ وَتَذْكِيرُ الْغُفْلِ كَمَا مَنْصِبٌ يُجَاهَدُ تَانِخًا.

ان کے اثر و رسوخ اور علوم و تربیت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کر دیا، امام الحرمین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی انھوں نے منادی کروادی کہ ابوالمعالی (امام الحرمین کی کنیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی تو فرمایا کہ جو امور قرآن سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے کیونکہ حکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم فیہا کے برابر ہے، روزہ رکھنا عید کرنا یا امور فتویٰ پر موقوف ہیں، بادشاہ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا، اور امام الحرمین کا حکم صحیح ہے۔

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد جو چار سو کے قریب تھے، سب نے روات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، سال بھر ان کا غم تازہ رہا۔

نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدۂ اشعری تھا، اور اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطق تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسے نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

علماء و اساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت واستحکام بخشا، مدرسہ نظامیہ بغداد
عالم اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا
اور پڑھنا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و فکر سے
متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔



علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور
ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتب خیال کے علماء تمام عالم اسلام، نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھٹن لگ گیا تھا، امام ابو الحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سر نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملک استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقت و شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیرو رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل و نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرز استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریق استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قبل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلک سلف کی صحیح نمائندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

لے جیسا کہ ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الرد علی المنطقیین میں کیا۔

خلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کار و واج

دوسری طرف مومن کی قدر دانی اور دلچسپی اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، غرضیات ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الہیات اور مابعد الطبیعیات کے مباحث اور دفتر تھے الہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصفیٰ (دیوالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکी سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرہ نسب بھی نہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوع انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہو شربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الہیات کے اس دفتر پارہ کو بھی صحیفہ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح بانٹھ لیا کہ گویا ان کے پاس پیغمبر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بصارت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفہ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۵ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۲۹ھ) اور شیخ بوعلی ابن سینا (م ۳۲۵ھ) کے سے پرچوش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہنچا دیا جو یونانی الہیات میں شاید مبداء اول (واجب الوجود) کو کبھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے جو پیغمبروں کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفہ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل ماخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشاء سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور مقولات کو بھی مقولات بنا دیا۔

جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالم اسلام پر فلسفہ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہین و متبحر شخص نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں اخوان الصفا کے نام سے فری مین کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بنی، قائم ہوئی، جس میں فلسفہ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

اِنَّ الشَّوْبَةَ الْاِسْلَامِيَّةَ قَدْ تَجَسَّسَتْ
اِسْلَامِي شَرِيعَتِ جہانوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے

بالجہالات واختلطت بالضلالات
گندی ہو گئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ
ولا سبیل الی غسلها وتطہیرھا الا بالفلسفۃ
دھویا اور پاک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
لانہا حادیۃ للعکمة الاعتقادیۃ والمصلمة
اعتقادی علوم و حکمت اور اجتہادی مصلحتوں
الاجتہادیۃ وانہ متى انتظمت الفلسفۃ
پر حاوی ہے اب صرف فلسفہ یونان اور شریعت
الیونانیۃ والشریعة المحمدیۃ فقد
محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
حصل الکمال^۱
ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقاء کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمریوں کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں پختگی اور جمود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔^۲

انہوں نے اس بحث و نظر کے نتیجہ میں ۵۲ رسائل مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ و ادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہنچ گئے۔^۳

معتزلہ و فلاسفہ کا فرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انہوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و مادرِ عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل کو باریک اطفال بنادیا

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً متقشف، سیاسی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے، اور یہ سب ان کے اصول و عقائد کا اقتضا تھا، اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و اسیحا و انکار نبوت، انکار معاد اور بے علمی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ تنہا اخلاقی جرات نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوتوں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی باز یافتگی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر اتنے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، صحنی الاسلام ج ۳ فصل اول ۱۱۵ ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار

ہوتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہو گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، مسلمانوں کو کفر و اکاذب کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انھوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ فَهْمٍ
لِّبَشَرٍ لَّهُمْ (سورہ ابراہیم ۴) اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا اگر اپنی قوم ہی کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کر دی ہے، یعنی و مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آ رہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آ رہے ہیں اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرام نے

اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسلاً بعد نسل وہ چیز امت تک پہنچی۔

منفصل ہوتی رہی انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرشتہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شکاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہونے ہیں اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں اور کچھ خالق ان خالق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، جہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلا خالق کے عالم ہیں اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل خالق کے رموز و اشارات ہیں ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان خالق تک نہیں پہنچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور نہایت نیچی سطح پر ہے جو خالق و رموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے اس کی گردن یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَيَصْنَعُ غَنَمَهُمْ مِثْرَهُمُ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

(تیسرے) اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے رہے ہو

اے تعطل شریعت کا مستقل عقیدہ بھی پایا جاتا تھا، ایک باطنی امام و داعی مبینہ اور پس لکھتے ہیں:-

لَقَدْ أَمَّلَ مُحَمَّدٌ بْنُ اِسْمَاعِيلَ وَهُوَ بَنِي نَاطِقٍ يَسْمَعُ شَرِيعَةَ مُحَمَّدٍ صَلَّي اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمِ اَعْمَلُ اِسْمَاعِيلَ كَوَالِدِہٖ
 نے بنی ناطق کی حیثیت سے نبوت فرمایا، اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کر دیا، (عاصمۃ نفوس المہندین
 و قاصمۃ ظہور المہتدین لیسیدنا ادریس) معزالدین الشرفاظمی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۴) میں ان پھندوں کے نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا، اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انھوں نے نبیؐ کو نبوتِ ملائکہ آخرت اور اصطلاحاتِ شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے بعض نامور نمونے یہ ہیں:

معنی اس ذات کا نام ہے جس پر قوتِ قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبریلؑ کی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان

کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے

غسل سے مراد تجدیدِ عہدِ زمزم سے مراد علمِ باطن کے لطف کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک

نہ ہو، طہارت سے مراد مذہبِ باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب کے برائے تمیم سے مراد اذن (اجازت یافتہ)

سے علم کا حصول، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفائیں

انشاعتِ علم، صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو

عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علمِ باطن، جہنم، علمِ ظاہر، کعبہ خود نبیؐ کی ذات ہے، بابِ کعبہ سے

مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفانِ لوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں

اہل شہادت عرق کر دیئے گئے، آتشِ نمرد سے مراد نمرد کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا

ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یا جوج یا جوج سے مراد اہل ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد

ان کی دلیل اور حجت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظِ شرعی کے متواتر و متواتر معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور

مغزوہ پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا، جس سے اسلام کے نظامِ اعتقاد و نظامِ فکر کے خلاف سازش

لے تو اعداءِ آلِ محمد (باطنیہ) تالیفِ محمد بن حسن الدلمی یا زما، تالیف ششمہ ص ۱۶۷

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈائنامیٹ کیا جاسکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرون ریاست قائم کی جاسکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوت محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی اس نے باطنیت کے اسی حربہ سے کام لیا، اور اس معنوی تواثر و توارث کا انکار کر کے پورے نظام اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

لے قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے اور معنوی توارث و تواثر کا علما انکار کیا ہے، ختم نبوت مسیح و نزول مسیح، حجرات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعات یہ ہیں "روزہ سال میں ایک ہی مہینہ کا ہے، مگر مہینہ ۱۹ دن کا ہے، روزہ کی ابتدا صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ۱۱ سال سے ۳۲ سال تک انسان احکام شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے، سجدے عورتوں پر نظر جائز ہے، کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانی مذہب (باب) کی ولادت ہوئی ہے، اس کی زیارت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے، ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض۔ مذہب بانی کی پیروی سے آدمی ظاہر ہو جاتا ہے، پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے، پانی ہمیشہ طاہر و مطہر رہتا ہے، بہائیوں کا قانون میراث علیحدہ ہے (حاضر اعیان عالم الاسلامی بحوالہ فرنج انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ "بابیت" میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے منشور کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظام دینی کی تاسیس ہے۔

درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

ظاہر ہے کہ ان "نکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کر سکتا تھا، لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں بے چارہ اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنہوں نے قدیم علم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزاری سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، کچھ جذبہ انتقام میں کچھ اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی ظاہر اور لشف کے رد عمل میں کچھ یو الہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں کچھ اہل بیت کے نام سے اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کر لی جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں، عالم اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صبح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہو گیا، اس بدامنی کے علاوہ انھوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام الحاد کا دروازہ کھل گیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دہنگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہد از نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو جو اپنے ذہن خدا داد جوہر طبع اور دقت نظر میں فلاسفہ یونان اور بہت سے

۱۔ باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی ص ۵۳، ۵۴"

قدیم ائمہ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقہ سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو وفور علم اور وسعت نظر کے ساتھ دولت یقین سے بھی مالا مال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی فکر، تلاش و تحقیق اور ریاضت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ دین کی پیروی اور رسول کے اقتدار کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالم اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالی کی تھی۔



امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۳۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک قلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، اُن کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر حرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام احرارین کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو بہت تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (مید) بن گئے، امام احرارین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحرِ خاں ہے، امام احرارین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبار السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع

تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں میں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھے۔

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور فہما ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۵۳ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس حسن تقریر اور تجربہ علمی کی بناء میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع فلاحی بن گئی تین تین سو غنی طالب علم اور سو سوا مراد و سارا اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسرین گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر ناری) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء اور وزراء اور خود بارگاہ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی، یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفہ عباسی (مقتدی باشر) نے ملک شاہ بلوچی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باشر کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے مستظہری رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر فائز کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلندی نے ان کو امام اور حجة الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالیؒ نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنہوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المقصد من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں:-

"غفوان شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی، ہر فرقہ اور جماعت کے ملتا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد دین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے، اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھائی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن کچھ بھی میرے یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حیات اور بدہیات کے دائرہ میں ہے، لیکن جب یہ بارہ کدو کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حواس بصارت کا ہے، لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حیات سے بھی زیادہ مشکوک و کمزور نظر آئے، تقریباً دو مہینے تک میری یہ ارتیا بی کیفیت رہی اور مجھ پر سفسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدہیات عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک جانی اور وہی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے جو طالب حق معلوم ہوتے تھے، مکمل جو اہل نقل و نظر ہوتے

کے مدعی تھے! طیبہ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں اور انھوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقانی حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہل منطق و اہل اثبات ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں، کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریقِ مقابل کے پیش کئے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلید تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نعوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدیہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقہٴ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب نقیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب کے تضاد ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بحرانی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے کے کہ جو فن مذہب کے متضاد ہوتا ہے وہ الہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھالی ہیں، درحقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہنچتی کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کا نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب "مستطہری" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دار و مدار امام وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امام وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے، اور یہ دونوں حد درجہ شبہ میں اب صرف تصویات باقی رہ گئیں ہیں، بہترین تصویات کی طرف متوجہ ہوا، ان تصویات علیٰ ہی ہے، علیٰ ہی ہے میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب کی کثرت القلوب اور حارث محاسی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جاسکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجود باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر، چرچ کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اخروی کی صورت

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدبیر سے کہ دایرہ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض، اور موانع و علالت سے قرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علالتِ دنیوی میں غرق ہوں میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، جو نہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص توجہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصولِ شہرت تھا تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، چھ مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا سنا دی پکارتا، کہ کوچِ قریب ہے، اٹھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفرِ پریش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت و مل میں چھ مہینے گزر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھاؤ لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کے اثر سے قوتِ ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطباء نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ
 مودن نہیں ہو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے الشکر کی طرف رجوع کیا اور
 اضطرابی کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ
 دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کر گئی
 اور بڑے لطافت اکیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں
 نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ
 اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی مسبب بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین
 منصب حاصل تھا، اِنَّكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع
 کیں، جو مرکز حکومت سے دور تھے انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے
 ایماء سے یہ خدمت ترک کی جا رہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ
 اہل حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں
 مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی
 چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ شخص سب چھوڑ بیٹھا کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی
 اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفایت رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں
 شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا،
 میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی دوستی و تہذیب اور
 ذکر الشکر کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں متکلف
 رہا، مسجد کے منائے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں
 بیت المقدس آیا، وہاں بھی دو دن صخرہ کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کر لیتا، سیدنا ابراہیم کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں اور دھیمی اور سکون قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا، دس برس اسی حالت میں گزر گئے، ان تہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا، کہ صوفیاء ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے، اخذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور باقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گزار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے بڑے عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلایق کو نفع ہو، اس مادہ و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احسان کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :-

”میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیان تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بے علمی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی اہل شہر کی عادت کی پیروی اور اپنی حفاظت کے لئے بعض احکام شرعی کی مادی منفعیتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جاسکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور باسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے، اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پاسکے گا، عہد نبوت سے بہت بعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلق خدا کو ان کی محبوبانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ توجہ لیکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطان وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا، میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھایا، اور اپنے لئے عزت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطان وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہنچنے کا تاکید حکم دیا، حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہنچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

”أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۚ“ نیز اپنے رسول کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے اس کا ارشاد ہے:-

”وَلَقَدْ كَذَّبَتْ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كَذَّبُوا وَآوَدُّوا حَتَّىٰ آتَاهُم نَصْرُنَا وَلَا مَبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ مَّبَرِ الْمُسْلِمِينَ ۚ“

میں نے چند اہل قلوب اور اہل شہادت سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالانفاقی مجھے ترک عزت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحا نے متوازن خواب بھی دیکھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کا عظیم ارادہ کر لیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الہی کی کار فرمائی تھی جس طرح بغداد سے نکلتا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیر آباد کہنا
 تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزت کے
 زمانہ میں خلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا۔
 غرض ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کو
 زینت دی اور دوبارہ تدریس و افتادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور
 اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ
 نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامورِ آلہ کار سمجھتے تھے، چنانچہ
 خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں:-

”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن حقیقت
 اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں
 زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصولِ جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے
 قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت
 دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا
 ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا، لیکن
 اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی
 اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی
 طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے
 کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح
 ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے، پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے، اور اس کے

فصل سے مجھے اتباع کی توفیق ہوا یا اطل مجھ پر واضح کرنے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے!

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

- ۱۔ امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔
- ۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عمل جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کا زمانہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ اسحاق دیاطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب ہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر نینے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، فلسفہ "جن" مفروضات پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابو الحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعتی تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات میں قیل و قال کی گنجائش نہیں اور دین کا اس سے نفیاً و اثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الہیات سے ہے، منطقیات میں بھی تنازعہ در غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں ضرورت و باطل کی آمیزش ہے اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکہ الآرا کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے مقاصد الفلاسفہ لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض و اختلاف کو پوری حرات و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت ور اور شگفتہ ہے کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر شائبہ سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی صفت اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز ہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

”ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں

سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو کے پرہیز نام سے، اور ان کی شان میں ان کے

مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیاً منطقیات و الہیات

میں انھوں نے بڑی موثر گافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسرہ نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلید انکار مذہب کو اپنا شعار بنایا، اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلا و حکما کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے امتیاز پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیکہ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں!

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقہ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول و افلاک کا پورا شجرہ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں :-

قلنا ما ذکرتموه تحکماً وھی علی التحقیق	تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور
ظلمات فوق ظلمات و حکماء الانسا	تحکماً ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
عن منام رأه لا استدلال علی سوء مزاجہ	کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے
	تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

لست ادری کیف یقع المجنون من نفسه	مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
هذه الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذین	باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے جو جا بیکوہ عقلا
یشقون الشرع بزعم فی المعقولات	جو بزعم خود مقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

استغنى بهم التعلق في التعظيم الى اب	ازید اول کی تعظیم میں مبالغہ کرتے تھے ان کو اس
البطالوا كل ما ينهم من العظمة وقر بوا	جہان کے پیارا کر انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو
حاله من حال الميت الذي لا خیر له	باطل قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں)
بما يحى في العالم لا آله فارق الميت	اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں
في شعوره نفسه فقط، وهكذا يفعل	کیا ہو رہا ہے صرف اس بات میں وہ مردہ غفلت سے
الله بالزأغين عن سبيله والذالكين	کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی
عن طريق الهدى المنكرين لقوله تعالى	نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی
”ما أشهدتهم خلق السموات والأرض	حشر کرتا ہے جو اس کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں
ولا خلق أنفسهم الطائفتين بالله طرقت	اور ہدایت کے راستے سے کتر جاتے ہیں جو
الشعور المعقدين ان اور الرلوية	اس آیت کے منکر ہیں“ میں نے ان کفار و
تتعل على كنهها القوى البشرية	مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے
المخرورين بعقولهم زاعمين ان فيها	وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش
منذ وحة عن تقليد الرسل واتباعهم	کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں،
ولا يحرم اضطروا الى الاعتراف بان	اور براعتقاد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ انہو
لياب معقولانهم رجع الى ما لو على	ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قوی حاوی ہو
في المنام لتعيب منه	ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ
	ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے

اجتماع کی ضرورت نہیں لامحالہ اس کا انجام یہ ہوا کہ
ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی
مضمکہ خبر باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان
کرے تو لوگ تعجب کریں۔

”تہافت الفلاسفہ کا اثر“

فلسفہ پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا
امام غزالیؒ کے سر ہے بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح (پوسٹ)
مارٹم کا فرض انجام دیا فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔
”تہافت الفلاسفہ“ نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کڑی ضرب لگائی اور اس کی عظمت ذہنی تقدس کو کافی
نقصان پہنچایا اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر
شوہر بس تک اس کے جواب میں کوئی شاہانِ شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری
کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پر جوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ گوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے ”تہافت التہافت“
کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو
فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو شوہر بس تک کے لئے پھر زندگی
عطا کر دی۔

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنہ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بقاء اور

مدرسہ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفہ وقت کے اشارہ سے المستظہری تالیف کی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خود نوشت تلاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجت الحق"، "مفصل الاختلاف"، "قاسم الباطنیہ" ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواہم الباطنیہ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ مؤثر آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کو چوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا اثر فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالی جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنادیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالی کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تہذیب کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

"احیاء علوم الدین"

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام

ملے، ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے جو اہل القرآن میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب لقیہ (م ۸۸۵ھ) جنہوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات ہے، عبدالغافر فارسی جو امام غزالیؒ کے معاصر اور امام احرارین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی، شیخ محمد کا زرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم شایعے جائیں تو میں احیاء العلوم سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا، حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ منہاج القاصدین کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انہوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کلمیابی پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالیؒ اہل وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے الغزالیؒ میں لکھا ہے :-

”بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھاننا کسی سے تسلی نہیں ہوئی آخر تصوف کی طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سد راہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیہ نفس شتات بینہما۔ ع

ایں رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کلمی پہن بغداد سے نکلے، اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن۔

اور ۲۰۳۵ قرین الایا بفضائل الاحیاء (شیخ عبد القادر احسنی)

ع بیاد آرزویاں بادہ پیا را

کے محاف سے افادہ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آئے کا آواگرا ہوا ہے، امیر و غریب عام و خاص عالم و جاہل،
رند و زاہد سب کے اخلاق تمام ہو چکے ہیں اور مہلتے جاتے ہیں علماء جو دہل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف
ہیں وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مریض نے
تمام عالم کو چھایا ہے، اور سعادت اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دہل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی
ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا ہے، اور
جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ
ہے)، وعظ (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مستح فخرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ
(جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے، اور
لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی۔

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لئے آمادگی اور شوق
اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی
نشاندہی کی جائے، جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو
آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاد پر
حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ خالق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح
گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادت اخروی اور رضائے الہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاشرہ سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مخالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علوم محمودہ اور علوم مذمومہ فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین و حکام پر جرات کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالفت دین رسوم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و بدل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور گہڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا وقت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب و ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یا معشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح ازا ملح فسد

اے جماعت علماء! وہ جو شہر کا نمک ہے۔ بھلا یہ تیرا کب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراض قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو الداء العضال فقد

الطبيب فان الاطباء هم العلماء

وقد مرضوا في هذه الاعمار مرضاً

شديداً وعجزوا عن علاجه۔

تیسرا سبب اور وہ لا علاج مرض کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ مریض موجود ہیں اور طبیب مفقود،

طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالمجملۃ اثمًا خضدت الرعیۃ
یفساد الملوك وفساد الملوك
یفساد العلماء فلولاً الفتنۃ الشوع
والعلماء الشوع لقل فساد الملوك
خوفامن انکاسهم
خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین
کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء
کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا نارس قاضی اور
علماء سورہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے
اور ان کے علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمہ حق
عند سلطان جابر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا
طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرات و
بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:-

یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی
ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت
فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت
خالص تھی اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگدل متاثر ہوتے تھے اب تو
حالات یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں اور وہ خاموش ہیں اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے
اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے
کام لیں اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

کافی توجہ ہے اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی اقتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابر!

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم کا علم فقہ کی جزئیات اور اخلاقی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپے چپے پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور غلو اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حد یہ ہے کہ اصلاحِ نفس تہذیبِ اخلاق اور سعادتِ اخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ بہت گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر و شکر، خوف ورجاء وغیرہ) بالغض و حسد و کینہ، ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص و توکل اور ریاء سے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے، اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ ایمان و ظہارِ سلیقہ و رمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سے لے گا جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بنانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

مناظرہ دیتا ہے اور دوسروں کو بھی، حالانکہ مجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عمدہ برآ ہو، تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھتا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہئے مثلاً کئے شہر میں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو اس کے بالفاظ میں علم فقہ بالخصوص خلافیات و جدیدات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بتلانا ہے میرے بھائی نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے اور ایسے فرض کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقات کی تولیت و صدیوں کی تفتیش اور غنیمتوں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضاء و افتاء پر تقرر اور معصروں اور محققوں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت وغلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

”کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں زیادہ درجائے کی ضرورت نہیں ایک طلبہ کو یہ کہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں جن کی شہادت شرعی امور میں مستعمل ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی کچی نہیں رکھتے اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے)“
وہ ایک جگہ عام بہالت و غفلت دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

”اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا شغل ہے کہ پھر اس نادر الوقوع ہرگز

دوراز کا تفصیلات اور ان علوم میں مشغولی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی ہو خود فرض کفایہ میں^۱

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علمائے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنالیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم فقیہ اور صاحب

فتویٰ تھے، ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے

علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں مہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا، تو وہ ایک دوسرے

پر محمول کرتے اور بہترین توجہ الی اللہ رہتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آتی جو

خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت

نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینا پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان کے وہ فتویٰ حاصل

کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے، جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور

سلف کی شان تھی، جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس)

کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور عہدہ قضا اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے

زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہل علم کا یہ استغناء اور بے پرواہی

دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصول جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا اقرب اور قضا و

افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے پس وہ اسی طرت توجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیشکش کی اور

ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار بنے، بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیداری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا، اور عیاض اور بتذل سلم پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے، اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کی طرف توجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ الشر کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی اور انتظامات اور مقتدا کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی، اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و عقائد سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فریق کے دلائل و مباحث نیل اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و تدرج کو ایک فن بنا دیا، ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جواب ہی، سنت کی نصرت اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت مقصود محض دین خدمت خلق، اور بندگان خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی اور اس تحقیق کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی میں کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے یہ دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوع سخن بنالیا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام احمد وغیرہ کے مذاہب اختلاف کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات کے حکام کو دلچسپی نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی باریکیوں کو

ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں، انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں، اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی، اور مسئلہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی کچھ اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا، اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے کچھ ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے، اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربت خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔^{۱۵}

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی درو حالی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔^{۱۶} اس سلسلہ میں ایک بڑا معاملہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے جو قرآن و حدیث، صحابہؓ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف ”فقہ“ کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشتغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو ”توحید“ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سرو پا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو ”تذکیر“ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارتوں کو ”حکمت“ کا خطاب یا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشتغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً فقہ

کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و ہزنیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت لَيَسْفَهْوُ إِلَى الدِّينِ اور حدیث مَنِ شَرَّ دِينًا بِمَنْ خَيْرَ رِافِعَةٍ فِي الدِّينِ "فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے" وَمَنْ يَتَوَلَّ الْعِلْمَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا کی بشارت، جاہل اور ناخدا ترس اعطوں کے حامی ازمواعظ کے لئے فَذَكَرَ اِمَامًا اَنْتَ مُذَكَّرٌ اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں 'قرونِ اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک کچھپ رو داد اور اصطلاحات اور عنوانات کی تغیر کی ایک سبق آموز تباہی ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں۔^{۲۵}

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبداللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین کا گائے والا قرار دیا تھا۔

وهل افسد الدين الا الملوك و افساد سوع و سها

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان، اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو سپام دیتا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

لہ چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتیٰ کہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

تھا، امام غزالی نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی
هذه الاعصار والحلال فی ایدیہم
معدوم و عزیز^۱
بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرام
سے خالی نہیں، حلال مال ان کے پاس یا تو سر
سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام
کلھا و اکثرھا و کیف لا والحلال
هو الصدقات والفقی والغنیمۃ ولا
وجود لھا و لیس یدخل منها فی ید السلطان
ولم یبق الا الجزیۃ وانھا تؤخذ بالوفاق
من الظلم لا محل اخذ ھا بلہ فانہم یجاوزون
حدود الشرع فی المأخوذ والمأخوذ منه
والوفاء لہ بالشروط ثم اذا نوب ذالک
الی ما ینصب الیہم من الخراج المضروب
علی المسلمین ومن المصادرات والرشا
صنوف الظلم لم یبلغ عشر مستشار^۲
عشیرۃ^۳
سلطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں
یا ان میں کا بڑا حصہ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ
حلال مدینہ نکوۃ ہے اور مال غنیمت کی میں اور ان کا
کہیں جو نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ کے پیونچے
نہیں پاتی لے دے کے صرف جزیہ کی سیم اور اس کا حال
یہ ہے کہ وہ مختلف نظامانہ طریقوں کے وصول کیا جاتا ہے
جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں حال سلطنت
حدود شریعت کے تجاوز کرتے ہیں نہ مال کی مقدار میں شریعت
کا کچھ پاس کیا جاتا ہے نہ ذی جن سے وصول کیا جاتا ہے
اس بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے نہ اس کے
شرائط پورے کئے جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج
مالوں اور جائیدادوں کی ضبطی رشوت اور راولع واقلم
کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے، اس کو

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں بہ کثرت دینی مفاسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جاسکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحا نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں :-

• دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دُجھولی اور استمالت کا خیال رہا کرتا تھا، اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس یہ قمیص اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حُرم آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور سرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بد دعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلاف شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے، اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جنان کو سلاطین سے فائدہ پہنچا ہے، اتنا ہی ان کو سلاطین کے اہم امور سے دینی نقصان پہنچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

• لیکن اس کے بعد آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر وغائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے اس سلسلے میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا تیسرا تعریف و دعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اعراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربارداری، جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت، دوستی اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بد اعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو، یہ سلاطین ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے، اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے، تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے غنے جلنے اور اختلاف کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دینا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی.... تفصیل معلوم ہوگئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جزو قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا حق ہے، اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکماء کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو، تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و نظام سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔

الحالة الثامنة ان يعتزل عنهم فلا يرام
دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ

ولا يرونه وهو الواجب والسلامة
خفا ہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہ واجب

فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على
ہے اور اسی میں حفاظت انسان کو ان کے مظالم کی بنا

ظلمهم ولا يجب بقاؤهم ولا يثنى
پران سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہئے وہ نہ ان کی

عليهم فلا يستعبر عن احوالهم ولا يستقر
زندگی کا خواہشمند ہونے ان کی تعریف کے لئے ان کے

الى المصلين بهم۔
حالات کی جستجو رکھے نہ ان کے مقررین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی اور جب شبہ پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مایات آمد و صرف پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار تاراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک اچھا خاصا جہاد تھا جس کی نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جاسکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمہ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ:-

» افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے ۱۰

محمد بن ملک شاہ کو جو ستر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا، اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا ۱۱

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی دروہست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزراء کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے، اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدنیوں، حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے خطوط شخصی جرأت، اظہارِ حق اور تاثیر و قوت انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

۱۰۔ بدایں کہ ایں نہر از قحط و ظلم و یران بود و تاخیر تو از اسفرائیں و دامنایں بود ہمہ می ترسیدند و ہفتانان
از بیم غلہ می فروختند و ظالمان از مظلومان عذری خواستند اکنون کہ اینجا رسیدی ہمہ ہر اس و خوف بر قات
و دہقانان و جازان تبد بر غلہ، دوکان نہادند و ظالمان دیگر گشتند اگر کسی کار ایں شہر بخلات ایں
شکایت می کند دشمن دین تست بدایں کہ دعائے مردمان طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را ایں نصیحت
بسیار کردم پذیرفت تا حال دے عبرت ہمہ گشت بشو ایں نغمہائے تلخ با منفعت از کسی کہ او طع گاہ خویش را
بہم سلاطین و داع کردہ است تا ایں سخن می تواند گفت و قدر ایں بشناس کہ نہ ہانا از کسے دیگر شنوی

۱۱۔ مکتوبات امام غزالی ۱۹۱ء یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور نصیحت الملوک کے نام سے موسوم ہے

چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہر کس کہ خبر اس می گوید با تو طبع وے حجاب است میان او و کلمہ حق“

مخیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”اما فریاد رسیدن خلق بر عموم واجب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد از ان کہ من شاہد این حال

می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از شاہدہ ظالماں بے رحمت

و بے حرمت خلاص یابم چون حکم ضروری معاودت افتاد ظلم بچنان متواتر است“

پھر وزیر اسبقین کا انجام لکھ کر مخیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں۔

”و بحقیقت شناسد کہ بیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نبود کہ وے درد و زکا و بیچ وزیر آن ظلم و خرابی نہ

رفت کہ اکنون می رود“ و اگرچہ وے کارہ است و ممکن در خبر نہیں است کہ چون ظالماں را روز قیامت

مواخذہ کنند ہم متعلقان را ہم ایشان را بدان ظلم بگیرند مسلمانان را کار باستخوان رسید متہل گشتند

و ہر دینارے کہ قسمت کردند اضعاف آن از رحمت بشد و سلطان نرسید و در میانہ ابدال عواماں و

ظالماں بردند“

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقہ علماء و طبقہ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے اس میں جس قدر

غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم

کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور

عام زندگی سے واقف ہیں اور ان کا زندگی کا مطالعہ پڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، انھوں نے مسلمانوں کی عمومی

زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے اس سے

ان کی قوت مشاہدہ اور قوت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے، ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔ اہل دولت اور اغیار پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا پھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور ٹھیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غنچاری نہیں کریں گے۔“

ابو نصرؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے؟ انھار نے ہذا شوق کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلب رضا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہیں ایسی تدبیر بتلا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگئی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے دو جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحب عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کہ اس کا دل خوش کرے اور

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے، اور اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سونفلی جوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے اور نہ اپنے دل کی بات ہم سے کہو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے، بشر میں کمر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہو تا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے، اور وہ اس وقت اعمالِ صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔^۱

دولت مندوں کا ایک گروہ بر بنائے بخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادت سے اس کو کچھ پی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور تم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مہلک بخل ان کے باطن پرستوی ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں، جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفر کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے، اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفل) نمازیں پڑھتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔^۲

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”عوام دولت مندوں اور فقرا میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو بجا اس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنالیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ محل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مجلس وعظ کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ محل کی محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجلس وعظ اور گریہ و بکا کی فضیلتیں سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الہی تو یہ ایذا یا نیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مریض کی سی ہے، جو کسی طبی کے مطب میں بیٹھتا ہے اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریح و تفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اغراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی فانی وعظ کو وسیلہ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ کراؤ۔“

ایک صلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے، اور بڑی حد تک یک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد و فقہ، تزکیہ نفس و تہذیب خلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چھید جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب نشر کے نشہ میں سرشار تھے، مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں) اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے، پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف و ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں سلیمیت کا غلبہ تھا، اس لئے بہت سے مشائخ متدلیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبویؐ اور احادیث اہل امام غزالیؒ جو کہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونہ کمال کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اجیار العلوم اور فلسفہ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحب جہاد محکم اور ایک صاحب دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفہ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفہ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اجیار العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراض قلب اور کیفیات نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دقت نظر اور سلامت فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حب جاہ

اجیار العلوم میں ”بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنه قلب لا یشدید المجاہدة“ (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے، یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اسے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

”معلوم ہوتا چاہئے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں، بعینہ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے، یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پیئنے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک لباس کے، اپنی

لے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف ہنسی استاد جامعہ القاہرہ کی تصنیفات ”تاریخ الاخلاق“ اور ”فلسفۃ الاخلاق“

وصلاتها بالفلسفة الغریقیة۔

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور ٹکیاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح سے ہندوگان خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہنچنا مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہنچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا، اس لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ باسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آرائش میں آجائے، چوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محافطوں، پہرہ داروں اور محفوظ مند قوتوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے

توان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں جو چوروں غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب محفوظ ملکیت زمین اور جائیداد ہے، لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے اور پھرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے، لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں اور جاہ کو کسی غصب سرزد کا خطرہ نہیں ہاں دلوں پر بھی غور بہت تصرف کیا جاسکتا ہے اور جس سے عقیدت مندی ہے اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جاسکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور یا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں ازبید و نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے اور کہیں جا کر کئی نہیں برخلافت مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے اس میں بغیر محنت و محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمو پذیر ہے اور اس کی کوئی حد نہیں مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے جاہ پھلتا پھوتا رہتا ہے اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو مال دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کر کے اکلقتیں دور کر دے، اس لئے کہ مال و جاہ محبوبا کا ذریعہ ہیں اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی اور انسان اموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے، اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہنچ جائے جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض برآری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو، اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں اس کے دو سبب ہیں، ایک، حلی جس کا ادراک سب کر سکتے ہیں، ایک، نفی جو بڑا سبب ہے لیکن اتنا نازک ہے کہ غبی تو غبی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت ہے جس کا علم باریک بین اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ کھا سکتے ہیں پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے، اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

عشق است دہزار بدگمانی

انسان کی بسراوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزوئیں بہت

طویل ہوتی ہیں اس کے دل میں بار بار خطرہ گذرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے، غلش اس کی جھبی دور ہو سکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے کبھی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فراموش کرتا رہتا ہے اور ان کے تصور سے لرزہ بر اندام رہتا ہے اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکر نہی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”دو دریں ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا دریں، اود مال کا دریں“ بعینہ یہی علت دور دراز کے شہروں اور میگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا درہن بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آسکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک امر ربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے
 "وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم
 کاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا
 حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ
 قلب میں ایک تو ایسی صفات (کھلنے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات
 قتل و ضرب و انڈاکا، اور ایک شیطانی صفات کمر و فریب کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت
 کبر و عظمت، عزت و تبحر اور سر بلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر
 سے مرکب ہے، جن کی شرح تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے، اس کی بنا پر انسان
 کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں کیتائی اور مستقل وجود جو
 کسی کا شرمندہ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفات الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے
 اور کمال یہی ہے کہ وجود میں کیتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا
 کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرہ کمال کے لئے داغ
 ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں کیتا نہ ہوتا اور وجود کی کیتائی اللہ تبارک تعالیٰ ہی کو حاصل
 ہے، اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا
 ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے، تو درحقیقت اس کے
 سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ معیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات
 کمال کے لئے نقص ہے، کمال وہی ہے جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش
 آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا
 وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوارِ قدس کی تابش کا فیضان

ہے یہ سب تابع ہیں متبوع نہیں پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے اور یہی کمال ہے انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں کیٹنا ہو بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاۃ صاۃ کہہ دیا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا عبودیت نفس اسی لئے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے جس کی طرف قُلِ الْوُحُوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہنچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوئی اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متنی ہے اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر دنیا میں جو کبھی موجود ہے اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا نامرغوب ہے اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہن منت ہو اگر وہ تمہارا رہن منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے وہ اپنی ذات کا عاشق ہے اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی میں یہ کم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکے اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرے انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں کچھ موجود ایسے ہیں جو

لے مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے :-

نفس مارا کمتر از فرعون نیست یک اور اعون مارا عون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات و صفات اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک کو اکب، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزاء، معدنیات، نباتات، حیوانات اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات، اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لئے کہ یہی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے، وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے، اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبہ حکومت و استعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کو اکب، عجائب، سموات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا، وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شرطی وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شرطی کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شرطی کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبہ یا جراثیم کے آئے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آئہ بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے، جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کر سکے ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ سپہ سالار ہے، لہذا کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے اور قدرت کمال ہے اور کمال صفات ربوبیت میں سے ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہے، چاہے اس کو اپنے پیسے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد و شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور غلبے ہو یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیکارے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا عیب اب بھی لذت اور عزت ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے اور انسان اس کا دیوانہ ہے۔ دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں اور یہ رے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے سخر ہو جائیں اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لئے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے، اور صفات ربوبیت سے مشابہت ہے، قلوب صرف محبت سے سخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفا الہیہ میں ہے، اور صفا الہیہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے اور یہ نسبت غیر فانی ہے نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الہی تک پہنچنے والی ہے اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا سخر ہونا ہے، اور جس کے لئے قلوب سخر

ہو گئے اس کو ان پر قدرت و استیلا حاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلا اکمال ہے اور کمال اوصاف
 ربوبیت میں سے ہے پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے
 مال و جاہ بھی اسباب قدرت ہیں اس لئے کہ وہ محبوب کے وسیلہ ہیں اور محبوب کے وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے پھر نہ معلوم
 کی کوئی انتہا ہے نہ قدرت کی کوئی انتہا ہے اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے جو معلوم
 کی جا سکتی ہے اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے جس پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے تو نہ شوق کو سکون اور نہ
 نقص کو زوال اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چیزیں بھی آسودہ نہیں ہو سکتے ہیں

محاسبہ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں،
 اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور
 امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیعہ بیان و اعطاء ایک
 نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنے مخاطبین کے حالات
 اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان کے بہتر و کالت کرتا ہے، اور بڑی
 قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مفسر و عالم نفسیات کی طرح
 ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مری کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا
 ہے اس لئے ان کے مواعظ صرف و اعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں ہر دور میں
 ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب
 کا ذریعہ بنے ہیں، کنائے آخری چوتھے حصہ (ربیع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک مختصر

میش کیا جاتا ہے، جہاں انہوں نے نفس کو جرد تو بیچ کی ہے، اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہئے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہئے المرابطۃ السادسة فی توبیخ النفس ومعابذہا، عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”اے نفس ذرا انصاف کر! اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو نصیر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو ہجرات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمان الہی اور صحتِ سماوی کا مستعمل تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے؟ جتنا کہ اس یہودی کا ایک فیاس و اندازہ، غفل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے! اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھوئے تو بغیر دلیل طلب کئے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے کیا انبیاء علماء اور یار اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ اس کی پٹریاں، اس کے گرز اس کا عذاب، اس کا زقوم، اور اس کے آنکڑے اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے، یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں اور ان پر تیرا ایمان ہے تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور مالِ مٹول سے کام لیتا ہے حالانکہ موت کین گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اُچکے جائے، اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے وہ کبھی بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے! ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے، اور وہاں کئی سال بیماری اور تامل میں گزار دیتا ہے اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا اقتضا کا منصب بغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے بہت دے دی گئی ہے، تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانے ہے، اور آج کل آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں سخت و مشقت ہے، کیا تو اس دن کا منظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا جنت ہمیشہ ناگوار یوں اور مکارہ سے گھری ہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے، کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے، تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آپ کی ہے وہ گزشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا، کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے، اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے ایک درخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزیرے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا، بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھیر پیٹے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب ہے، سرسبز شاخ لچک لکھتی ہے اور جھکائی جاسکتی ہے، جب کھ جائے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر اے نفس اتوان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور بہل انگاری سے کام لیتا ہے، تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے، غائبانہ تو یہ کہے کہ انتقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے اگر یہی بات ہے تو تیری غباوت کتنی بڑھی ہوئی ہے اور تیرا عذر کتنا لنگ ہے اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابد الابد تک کے لئے ہو اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے اگر تو خواہشات کا حریص ہے اور تجھے لذت ہی عزیز ہے تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہئے، اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کی لقموں سے محروم کر دیتا ہے تیرا کیا خیال ہے اس مرضی کے بارے میں جس کو طبیب نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کر سکے پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے اس نے اس کو خبردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے اگر اس نے بد پرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھولینا پڑے گا، اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین دن صبر کر لینا چاہئے تاکہ زندگی آرام سے گزرے یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہئے پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت محروم رہے؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابلہ میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابد الابد کی زندگی کے مقابلہ میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف طبقات جہنم میں عذابِ نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا، وہ عذابِ الہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دوجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے ایک کفرِ خفی اور ایک صریح حماقت کفرِ خفی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے اور ثوابِ نقاب سے تو ناواقف ہے اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ خفی اور اس کے استدراج کا خیال کے بغیر اس کے مفو و کرم پر اعتماد ہے اس کے باوجود کہ توروں کے ایک ٹکڑے غلہ کے ایک ادا در زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار قبل کرتا ہے اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکئی من دان نفسه وعمل لما بعد الموت ولا یحق فی اتباع نفسه هو اھل او حق علی اللہ الامانی“ (ہو شیار وہ ہے جو اپنے نفس کا مایا سب کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر آرزو میں باندھنا ہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہر گز مین سے ہوشیار رہنا چاہئے تھا، اور شیطان سے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے، تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر، تیرے پاس کئی چنی سائیس ہیں اگر تیری ایک سانس بھی رائگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے فراغت کو مصروفیت سے پہلے دولت کو غربت سے پہلے شباب کو ضیعی سے پہلے زندگی کو ہلاکت سے پہلے اور آخرت کے لئے تیاری کر اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے اے نفس کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا، خوراک کا ذخیرہ لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ڈھیر جمع نہیں کر لیتا تو تمام ضروری سامان جاڑے کا مہیا کر لیتا ہے اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ بادہ جو اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گزار دے گا اور تجھ میں اس کی طاقت ہے کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زمہریہ جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے ہرگز نہیں اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر کسی کے اس سے نجات حاصل کرے گا جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے بادہ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی توحید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیئے اور ایسا بے سامان کر دیئے ہیں اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو مال دے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے چقمان کے طریقہ پر

پتھر سے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور آونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں انسانوں کی ضرورت ہے اسی طرح طاعت و عبادت بھی خدا مستغنی ہے اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو۔ ”مَنْ أَحْسَنَ وَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلِمَ أَنَّهُ عَنِ الْعَالَمِينَ“ (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے اور اللہ جہاں والوں سے بے پرواہ ہے) تیری خرابی ہوئے نفس اچھالت کی فبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر ”فَمَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْتَكُمُ إِلَّا الْكَفَىٰ ۚ وَهَدَىٰ سَبِيلَكُمْ لِيُخْرِجَكُمْ مِنْ الْأَرْضِ بِقَرَارٍ ۚ فَكَيْفَ تَكْفُرُونَ“ (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اُسے دھرتے ہیں) ”لَمَّا بَدَأْنَا الْخَلْقَ الْأَوَّلَ ۚ بَدَأْنَاهُ مِنْ نَارٍ ۚ فَمِنْ دُونِهَا عَمَلْنَا الْمُكْتَسَبَ لَِ الْغَنَىٰ ۚ فَلَمَّا بَدَأْنَا الْآخَرَ ۚ بَدَأْنَاهُ مِنْ نَارٍ ۚ فَمِنْ دُونِهَا عَمَلْنَا الْمُكْتَسَبَ لَِ الْغَنَىٰ ۚ فَلَمَّا بَدَأْنَا الْآخَرَ ۚ بَدَأْنَاهُ مِنْ نَارٍ ۚ فَمِنْ دُونِهَا عَمَلْنَا الْمُكْتَسَبَ لَِ الْغَنَىٰ ۚ“ (جیسے اس نے تم کو ابتدا پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۔

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید“ (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں اور توحید نبوت اور معاد متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں اور اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالفت ہیں مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک جاتی ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی جس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے اس لئے کچھ عجیب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں جو ابن تیمیہ کے نزدیک کتاب و سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں اور ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے، تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہل تصوف کے بعض تشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں بلکہ موضوع روایات تک ہیں، اس کے باوجود شیخ الاسلام لکھتے ہیں :-

وفيه مع ذلك من كلام المشايخ الصوفية	اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صاحب
العارفين المستقيمين في اعمال القلوب	معرفت استقامت تھے اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا
الموافق للكتاب والسنة ما هو اكثر مما	ایسا کلام ہے جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور جس کا
يرد منه فلهذا اختلف فيه اجتهاد	اکثر حصہ قابل قبول ہے اسی بنا پر اس کتاب کے
الناس وتنازعوا فيه	بارہ میں علماء مختلف رائے رکھتے ہیں اور سب اس کے

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے عدم اشتغال ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب الفیہ نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔ ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگزاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراض قلب (ریا و حب جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلے میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیئے ہیں جو قابل تقلید نہیں ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے، ان نقائص کے باوجود وہ

۱۔ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص ۱۹، اور التاج المکمل لتواب صدیق حسن خاں ص ۲۸۸

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۱۹ ۳۔ المغنم ج ۹ ص ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱ ۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ص ۱۶۹

اجزاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں اور انھوں نے خود منہاج القاصدین کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی بروح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لئے یہ شکل تھا کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقل محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جائیں اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہوتے پائے بدقسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، مشکلیں اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابو الحسن اشعری اور علامہ ابوبکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں ان کو بھی بعینہ تسلیم کیا جائے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفات باری تعالیٰ نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے مشکلمانہ انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے مشکلیں کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو مشکلیں کے استدلال زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی جس کے لئے مشکلیں اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم شان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابو الحسن اشعری اور ان کے نامور مقلدین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب منسلک اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چسپی سمجھیں تھا، اور اس حلقہ کے بہت سے پرہیزگار اس میں ذلیع و ضلال اور مسلک سلف سے بعد و انحراف محسوس کرتے تھے، اچھا، العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چھینک و بیاں بہت بڑھ گئیں، اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی شخص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورت حال کی اطلاع دینے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں یہ تحریر فرماتے ہیں:-

”برادر شفیق! حامدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسرار دین) پر کلمہ پیتی کر رہا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدیم اسلام اور شائع اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے اور تمہارا دل جلتا ہے، میں اس واقعہ ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاعن سے نہ بچ سکے تو میری کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے، اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے، تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے۔“

اس لئے کہ صفت بتا رہی ہے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذات الہی سے رائد
 کوئی صفت نہیں ہے اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں،
 اشعری باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں غلط
 سمجھا جائے اگر کہا جائے کہ اشعری مقدم میں تو خود اشعری سے معتزلہ مقدم ہیں تو پھر معتزلہ کو برحق
 ہونا چاہئے یا یہ بعض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے؟ تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے
 کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے
 اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں
 محروم رہیں اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے؟

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامت طبع، حق پسندی
 اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے اور بعض اوقات اس کا ضرر
 اس کے نفع سے زیادہ ہے نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے اور ایک دوا ہے جس کی صحیح المزاج اور
 سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے اور جس سے کوئی انسان
 مستثنیٰ نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے اور کوئی
 اس سے محروم نہیں، إجماع العوام عن علم الکلام میں جو ان کی آخری تصنیف ہے لکھتے ہیں۔

فأدلة القرآن مثل الغذاء وينتفع به	قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ
كل انسان ودألة المتكلمين مثل الدواء	اٹھاتا ہے اور تکلمی دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے
وينتفع به أمم الناس ويستغنى به الأكثرو	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل أدلة القرآن كالماء الذي ينتفع به	نقصان ہوتا ہے بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی

القصبی الرضیع والرجل القوى
جس سے دودھ پتیا پچ اور طاقتور آدمی کیسا فائدہ
وسائر الادلة كالاطعمة التي ينتفع
اٹھاتے ہیں باقی دلائل (کلاسیہ) کھانے کے اذیاء واقعا
بها الاقویاء مرة وعرضون بها الخری
کا طرح ہیں اگر کبھی ان طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے
ولا ينتفع بها الصبيان اصلا^۱
اور کبھی ضرر اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں:-

والدلیل علی ضرر الخلق به المشاهدة
لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی
والعیان والتجربة وماتار من الشر
دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے اہل تجربہ جانتے ہیں کہ
مندفع المتكلم وقت مساعة الكلام مع
جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علم کلام کا چرچا ہوا
سلامة العصور الاول من الصحابة عن مثل
کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی، صحابہ کا دور اس
ذالك^۲
خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۷۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کو دوبارہ آباد کیا تھا، یہ
سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا،
(فخر الملک) محرم ۸۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد
امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی
ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

۸۰۰ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پرکردی گئی تھی مگر

خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، توام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لکھتا ہے

”ونیر از سر اے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) ذریعت نمودند و تدبیر آں را مبالغہ فرمودند“

وایں خطاب صادر شد تا صدر الدینؒ بہ تحفظ این خبر بخوابد اہل زین الدین حجت الاسلام، قریب الزمان ابو حامد

بن محمد الغزالی ادام اللہ تہک، اہتمام نہ گیر و از انچہ او یگانہ جہاں و قدوہ عالم و انگشت نمائے روزگار است“

اس فرمان پر دوبار خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ”حاشیہ بوسان خلافت“

اور ارکان سلطنت سب امام صاحب کے قدم کے لئے چشم براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو

جو خط لکھا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درس گاہ عام بن جائے گی، لیکن

جس طرح آپ مقتدرائے روزگار ہیں، آپ کی قیام گاہ بھی وہی شہر ہونا چاہئے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو،

تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی و ہاں پہنچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دارالسلام بغداد ہے۔“

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طول طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد

عذر لکھے: ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی،

دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ کن وطن

کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا،

اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربار خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا، او

لے صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائیداد نہیں، غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کد ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشہ عافیت سے باہر نہ نکلے۔

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گزاری، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے، جیسی انھوں نے علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی یحییٰ لڑائی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گزاری، ابن عساکر کہتے ہیں:-

وكانت خاتمة امره اقباله على حديث ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی

المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علماء حدیث

اہلہ و مطالعۃ الصحیحین البخاری و مسلم کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا

الذین هم احوالہ الاسلام مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۵ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی، جو اصول فقہ کے ارکان ثلاثہ میں شمار کی جاتی ہے، اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتبار کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طبران میں ۱۴۰ ہجری الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور

۱۵۰ غزالی ص ۲۱ ۲۵ تبیین کذب المفتری ص ۲۹۶ ۳۵ یتیم کتابین جو اصول فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں

حسبیل میں، ابوالیحییٰ البصری کی (المعتمد) امام احرار میں کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ گنج گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

”دو شنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواہی اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوا یا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا ”آقا کا حکم سرائے آنکھوں پر یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی“

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، ’اخلاص‘، ’علوہمت‘، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے پکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں کے اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان کے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کر والی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ابک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حب جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علوہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے معاصرین کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے، ان کا ان میں یہی صدا آئی کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تفسیر میں مشغول رہے، پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلے میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فرو گذار نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوعلی فارسی (م ۷۴۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہونچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلے میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

”امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خیر ہی بگاڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے، اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب جبار العلوم شائع ہوئی اور ۱۲۷۷ھ میں اسپین میں پہونچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا، تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا، اور نہایت بیدریگی اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو سخت رنج ہوا، اسی اشار میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبد اللہ تومرت تھا، یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آباء واجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور جماعت حوصلہ چلے آئے تھے

امام صاحب کی خدمت میں کیا اس تمام عظیم میں نعمت کمال میں کہ اور اپنے ذاتی و عہد الہی کے
کی فیض صحبت سے یہ راہ کھلا کر ایسے میں علی بن یوسف کی سلطنت کو ٹکرا کر ایک نئی سلطنت کے ساتھ
یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ وہ ایک عادلانہ سلطنت کے
تھے اس رائے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس فہم کے انجام دینے کے اسباب بھی میسر ہیں یا نہیں
محمد بن عبد اللہ نے اطمینان دلایا تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجازت دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں
ولقی فیما زعموا بالاحمد الغزالی وواقفہ جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے وہ ابو حامد غزالی سے تھا
بذات صدرہ فارادہ علیہ ملاکات فہم اس نے اپنے دل خیالات کے متعلق شہرہ کرا اما انما
الاسلام یومئذ باقطار الارض من الخلال اس کی تائید کہ چونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا

لے چو کہ محمد بن عبد اللہ نے ایک عظیم انسان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا تھا اس لئے اس کا
ایک مختصر حال طبقات الشافعیہ میں اسکی سے نقل کرتے ہیں۔

”محمد بن عبد اللہ اقصا مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشوونما پایا پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی وہ جہات
پر سفر گزارا عابد اور قناعت پسند تھا قانع تحصیل ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کمر بستہ ہوا مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناسبت سے
روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا
۵۰۰ھ میں مہدیہ پہنچا اور اپنے کام میں مشغول ہوا وہاں پہل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی امر بالمعروف کی خدمت
انجام دی یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفیق نے اس کو دوبارہ میں طلب کیا، دوبارہ
کے علماء نے اس کا کہنا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبد اللہ نے نہایت جوش
کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا قیوگے مال پر دست رازی نہیں کی جاتی؟ اس کی
پر جوش تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغمت میں آیا اور

رفتہ رفتہ ایک جگہ کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تمل میں قیام کر کے قبیلہ مصاہ کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالی، شروع کی اور کایا ہوا

الدولة وتقويض أركان السلطان
 الجوامع للأمة المقيم للعلم بعد ان سأل
 عن له من العصاة والقبائل التي
 يكون بها الاعتزاز والمنعة -
 میں ضعیف ہو رہا تھا اور کوئی ایسا سلطان موجود
 نہ تھا جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور میں اسلام کو
 قائم رکھے لیکن پہلے امام مٹانے اس پوچھ لیا کرتا ہے
 پس اسنامہ سامان اور جمعیت یا نہیں جس سے

قوت اور حفاظت ہو سکے۔

غرض محمد بن عبداللہ بن توہرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد
 ڈالی جو مدت تک قائم رہی اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جو رونہی
 بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور عفت مآب خاتونوں کے ناموس
 کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الشاد ستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے
 تھے اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ "لمشین" کہلاتے تھے، محمد بن توہرت نے اول اول یہی
 دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں مشین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت
 قائم ہو گئی، توہرت نے خود قراقرز والی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبداللہ المؤمن تھا تخت نشین کیا،
 عبداللہ المؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی جو امام غزالی کی
 مٹا تھی ابن خلدون کتاب ثالث "اخیر بربر" فصل ثالث میں عبداللہ المؤمن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر
 کا کیا جاتا تھا، اور انہوں کی فریادیں جاتی تھی رعایا پر ظالم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا
 ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا انداز تھا
 فوجی طاقت سے مضبوط کر دیے گئے تھے اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی"۔

امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر

ان علمی و علمی کمالات طاقن اور جامع شخصیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی توجہ اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی علمی پایہ ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صد ہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وقیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوتِ تذکیر کی ضرورتِ اصلاحِ عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوتِ تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں، عملی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مداوا ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو، اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تذکیر، اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصد زندگی حصولِ دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، عجمی تہذیب معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے بچے گرو رکھے تھے اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم ہر زندگی بن گئی تھیں زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام رس مزاج شاس مہتمم پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امرا کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پران کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، ہوا میرا نہ ٹھاٹ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے، اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایشاور ہمدردی اور جذبہ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت اور یقین و خودداری محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو سیدار کرے اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی سمتی، اور بلند جوہلگی سے کام لے، اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واشگاف بیان کیا جائے، اہل دنیا اور ارباب دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تا بیسویں اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی، اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمہ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابوالکلی شیرازی (م ۴۷۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے تبحر عالم اور صاحب فنون، ابوالوفاء ابن عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبدالقادر جیلانی (م ۵۴۱ھ) جیسے صاحب ذوق اور مجتہد فن، ابو زکریا تبریزی (م ۵۲۰ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابوالقاسم اکبریری (م ۵۱۶ھ) جیسے شار اور صاحب طرز نظر آتے ہیں، جنہوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

و قیغ دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابد جاہل" یا "واعظ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس و خطہ اور حلقہ درس میں یقین کی قوت ایمان کی حرارت، اہل شک و ارنیاب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکون قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و ثنائین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے علموں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوت عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دُوداعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا، جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں ایک کا نام نامی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمن بن ابی حزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکز اعصاب و اس کا علمی و سیاسی دارالسلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب حنبلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و

اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان میں ۳۷۵ھ میں ہوئی آپ کا نسب اس واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتهی ہوتا ہے ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۳۸۵ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالی نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیر باد کہا تھا، بعض اتقاق نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند جوہلگی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود اپنے تحصیل علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحب فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی آپ کے اساتذہ میں ابو الوفاء ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلائی اور ابو زکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمہ فن کا نام

لے جیلان یا گیلان کو ولیم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں برز کا پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندران کا مشرقی حصہ ہے اور شمال میں بحر قزوین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرة المعارف)۔

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید مخزومی سے تکمیل کی اور اجازت حاصل کی ہے۔

اصلاح و ارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے ہند درس، اور سند ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد و شیخ شیخ مخزومی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کر کے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنادیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، الشہداء نے اسی وجہ سے قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب متغی کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہاء کا کچھ شمار نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دوا تیں شمار کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلبیہ کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

حماد و اخلاق

بایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور کسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

۱۔ شہرانی نے لکھا ہے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر مشائخ اور صوفیہ انہی سے وابستہ تھے، ۲۔ شہرستان شہر میں انتقال ہوا طبقاً الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۷ اصل نام مبارک بن علی بن اکسین، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم فنیہ میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس افتاء سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفا معتدل مسلک کہنے والے اور اپنے فرائض میں بہت صائب الرائے تھے، ۳۔ شہرستان میں وفات پائی۔ ۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات الحنابلہ (ابن رجب)

بہسکے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، جوں نکالتے، لیکن اس کے برعکس کسی معزز آدمی اور ارکانِ سلطنت کی تنظیم میں کھڑے نہ ہوتے، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۔

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسنِ اخلاق، علوِ حوصلہ، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (حواہ) جنھوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:-

ما رأیت عینای احسن خلقاً ولا اوسع	میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبد القادر سے بڑھ کر
صدراً ولا اکرم نفساً ولا الطفت قلباً	کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم نفس، رقیب القلب
ولا احفظ عهداً او وداً من سیدنا الشیخ	محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ
عبد القادر ولقد کان مع جلالة قدره	عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے
وعلمه منزلة وسعة علمه یقف	کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت
مع الصغیر ویوقر الکبیر ویبدأ بالسلام	فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ
ویمجالس الضعفاء یتواضع للفقراء	تواضع و انکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی
وماقام لاحد من العظماء ولا الاعیان	سربراہ اور دہ یارئیں کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہو
ولا التہنأب وزیر ولا سلطان	اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشجلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:-

کان محباب الدعوة سریع الدمعة آپ ستیاب الدعوات تھے، (اگر کوئی عبرت اور

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب
رقت کی بات کی جاتی تو جلدی آنکھوں میں آنسو
دائم البشر کریم النفس، معنی الید
آجاتے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے، بڑے رقیق
عزیز العلم، شریف الاخلاق، طیب
القلب تھے، خندہ پیشانی، شگفتہ رو، کریم النفس،
الاعراق مع قدم راسخ فی العبادۃ
فرخ دست، وسیع علم بلند اخلاق، عالی نسب،
والاجتهاد،
عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔

مفتی عراق محی الدین ابو عید الشریح محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:-

ابعد الناس عن الفحش اقرب
غیر منہب بات سے انتہائی دور، حق اور معقول
الناس الی الحق شدید الباس
بات بہت قریب اگر احکام خداوندی اور
اذ انتہکت عظام اللہ عز وجل
حدِ الہی میں کسی پر دمت و رازی ہوتی تو آپ کو
لا ینغضب لنفسه ولا ینتصر لغيره
جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، او
الشر عز وجل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرنے خواہ بدن کا
کیڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن
النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں
یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں اگر ہزار
دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے، صاحب "تلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ حکم تھا کہ رات کو وسیع
دستر خوان بچھے، خود مہانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے اور نچلے فرماتے ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کے یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور محاذ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر سم کھالتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا اخفاء فرماتے۔^۱

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تو اترو کو پہنچ گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا، جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی اور عالم اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں اور رہزن خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔^۲

جیلانی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانہ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔^۳

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرت کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

^۱ لے قلائد البواہر ص ۹ ^۲ ذیل طبقات ابن ابی شیبہ ص ۱۳۰ ^۳ قلائد البواہر مختلف کتب تذکرہ

تعلیمی مشاغل و خدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس و اخلاق کی اصلاح و تربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس و تدریس، افتاء اور تصبیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت و حمایت سے غافل نہ تھے، عقائد و اصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی و عملی بدعات کا باز اثر ہو گیا، ابن السمعانی کہتے ہیں کہ تبعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پلہ ابھاری ہو گیا۔ مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافات ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہب شافعی اور مذہب حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے، اور بڑی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء استفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو، اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ کے پاس استفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ طمان اس کے لئے خالی کر دیا جائے اور وہ سات چکر کر کے خلاء کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علمائے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیر سے عبادت کرے اور اپنی

قسم پوری کرے اس لئے کہ طواف بیت الشریعہ موقوف ہے اور طواف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں ہے۔

استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعت محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ ”ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبد القادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبد القادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ الشریعہ ہر بانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔“

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، تو شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔

تفویض و توحید

تسلیم و تفویض اور توحیدِ کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ ستر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگران
ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیا داروں یا امیروں اور درود کھٹیں طلبیوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریہ و زاری و حمد و ثناء کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے، خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آ رہتا ہے، اور ہمیشہ سوال و دعا اور گریہ و زاری اور ستائش و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کو دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (مقطع ہو جاتے ہیں اور وہ سب) علیحدہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے، اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے اور روح صرف رہ جاتا ہے اسے فعل حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحب یقین ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے، اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشائش و بندش، موت و زندگی، عزت

ذلت، غنا و فقر، اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کرٹا پٹا جاتا ہے اور بگاڑا بنایا جاتا ہے اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں نہ اپنے لئے نہ کسی اور کے لئے یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے اور اپنے مالک و اس کے فعل کے سوا کچھ دیکھتا سنتا ہے کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے تو اس کی صنعت اور اگر سنتا ہے تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (ہر چیز کو) جانتا ہے اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے اس کی تقریب (جاذبہ) سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اس کے نور معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا خرد و لباس پہنتا ہے اس کے علوم عجیب و نادر پر مطلع ہوتا ہے اس کے قدرت کے اسرار سے شرف ہوتا ہے اس کی ذات پاک سے (ہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے!

خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی اور جو نائبین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور دراصل حدیث دیگران میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔

”اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اثر سے ان کا دل بھر جاتا ہے ان لوگوں پر

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے، وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے، اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے، اور آنکھیں روتی رہتی ہیں، اور زبان ان نعمتوں پر جو خدائے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں، خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے۔^۱

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۳۷۲ سال گزائے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مستند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظهر بالله ابوالعباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد راشد المقتضی لامر اللہ والمتنجد بالله تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔ اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور محقول خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود

لے فتوح الغیب نقار (۲)، ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کا کوڑی (رموز الغیب) ص ۱۵۱، ابن کثیر نے اس کے مناقب میں

لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، موصلا، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گزار خلیفہ تھا، اور خاص عام (باقی ص ۲۰۷)

اور اس کے درمیان جو مکر ہو اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:-

”سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سب نے یہ باجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کرے، ملک سعود نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستے میں قتل کر دیا۔“

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر ابولک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوز و درد نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی ۲۰۷ کا) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۴۵ سال ۳ ماہ

کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ سال ۱۰ ماہ ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۷)

کے ساتھ وعظ و ارشاد، دعوت و تربیت، اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حب دنیا کی تحقیر و تذلیل، ایمانی شعور کے احیاء، عقیدہ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیبِ اخلاق، توحیدِ خالص اور اخلاصِ کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نابین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحیدِ خالص اور غیر الشریٰ بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو اربابِ کبار کے درجہ دے دیا گیا،

تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

”کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب دابّل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موہیں زبردست پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری بہاؤ بہت زوروں پر ہے، اٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کر اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ابلان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس نکلے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے، تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹائے اور اس خوف و امید ترک کر دے، اور نکلے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور رسول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر ہے۔“

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

”اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے بنبھالے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سزا پہنچا دے اور بدبو اور لپٹ سمیٹی اور نفس بدکار و رفیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک فطرت؟ کب تک خواہش؟ کب تک

رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک اسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان، گرائیوں سے بیکدوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔^۱

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح و اشکاف بیان فرماتے ہیں:-

”ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو ان باتھوں کو ادیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موصد اور نیکو کار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں، جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں، جو صاف ہیں، جو شفاف اس پر قادر ہوا، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہاں بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو اسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں دخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔“

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا مبعود ہے اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے، تو وہ تیرا مبعود ہے۔
ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکار سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

”تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی اور خیر نہ پڑ جاتا ہے یا تو جدائی ہو جاتی ہے یا وہ مرجاتا ہے یا بخش ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو؟ کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ اسے“ اور یہ ارشاد کہ ”میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے بتلا کرتا ہے پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے“ عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا“ اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کر لے خاص اپنے لئے بغیر شریک کے اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آ جاتا ہے کہ ”وہ ان لوگوں کو

دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جواہل و عیال و دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب کے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پردے ڈال دیے جاتے ہیں اور اس کے گرد اگر دُکریائی اور سطوت کی خدقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضرت نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کی غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انہیں نفع پہنچانے کے لئے لے

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل

طبقہ کی دُجوئی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں، ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”اے خالی ہاتھ فقیر! وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گناہ بھوکے پیاسے ننگے، بگر چھلے ہوئے، اے ہر سجد و خرابات سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھٹکائے ہوئے، اے وہ کہ ہر مراد سے محروم، خاک پر پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور اراٹوں کے (کشتوں کے) پستے لگے ہیں، مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا اور حبیت (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا“ اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گناہ کیا، اور خلق میں او میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نکھچا کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں، اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے، اور میں بھی، اور ایک باپ آدم و حوا کی اولاد میں، و نون میں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت میاں زمین (کے مثل) بے ریت ہے، اور رحمت حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرد اگر دہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیج اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کٹے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے، کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے، اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبی میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں، نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈکان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کا کہ بدل میں جو وہ کرتے رہے ہیں، جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر و مقدرات میں تقویٰ و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے اور نعمت دنیاوی دی اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ ریلی اور پھر ملی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا وقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو اور وہ کھاد دینا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہال اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں حفاظت ہو اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے اور پھل جاتے رہیں گے پس گھر ہی اجر جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اے فقیر اور ناتمند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے اور اس قوت سے خالی جو ترے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے اس کی مضبوطی اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس سمجھ کو نظر آتی ہیں اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی سزوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تو نگری اور نعمتوں کے عطا ہونے کی نہ پروا رہے گی!

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں وہ دنیا کے استعمال اور اس کے بقدر ضرورت

انتفاع سے منع نہیں فرماتے اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں،

ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی "اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی، یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر میں ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو ذیل کرتی ہے کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تو نگری کے قدم پر^۱۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے :-

"دنیا! تم میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازہ سے آگے گھٹانہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے^۲۔

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ، پسند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفہ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :-

کان یا مری بالمعروف ونہی عن المنکر
للقضاء والوزراء والسلاطین والقضاة
والخاصة والعامة یصدقهم بذلك
علی رؤس الاشهاد ورؤس المنابر و
المحافل وینکر علی من یولی الظلمة
ولا تأخذ فی الله لومة لائم

آپ خلفاء ووزراء سلاطین قضاة خواص وخواص
سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بری
صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
برسر تبر علی الاعلان ٹوک دیتے جو کسی ظالم کو حاکم
بناتا، اس پر اعتراض کرتے اور عدل کے معاملہ میں
کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب قلاؤد الجواہر لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتدی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المظفر کو
قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر تبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔
ولیت علی المسلمین اظلم الظالمین
ما جوابك غدا عند رب العالمین
ارحم الراحمین۔

تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو
اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے دن تم اس رب
العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے؟

موتیخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ بر اندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور اس نے
اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔

حضرت شیخ ان درباری سرکاری علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دردی فرماتے تھے جنہوں نے
سلاطین اور ناخدا نرس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا جن کی
وجہ سے ان سلاطین حکام کو زیادہ جرأت اور بے خونی پیدا ہو گئی تھی ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔
”اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو!
اے بندگان خدا کے ڈاکو! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (بغلا) ہو یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے علم

اور اے زاہد و شاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان کے دنیا کا زوال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں، بارالہ! منافقوں کی شوکت توڑ دے، اور ان کو ذلیل فرمایا، ان کو توبہ کی توفیق دے، اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے، یا ان کی اصلاح فرما۔

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنا رہے گا، جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں ہے۔“

دین کے لئے دلسوزی اور فکر مندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سبب بڑا مرکز خود بخدا تھا) دیکھ دیکھ کر گڑھتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حسرت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں، اور اس کی بنیاد کھری جاتی ہیں، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں، اور جو ڈھکے گیا ہے اس کو درست

کردیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے اے سورج، اے چاند اور اے دن
تم سب آؤ!

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

”اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہنے والوں اور ایسی
باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے،
اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف خور کر و کر امر و نہی بھی کرتے تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے (اور رفتہ
انتقال پا کر ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتاب بھی شکار کرنے اور کھیتی اور
موشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے اور اسے دیکھ کر (خوشی کے
ماتے) کھلاریاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دو لالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا
کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو
مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا
ہے اور اس کی حدود و شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔“

بیعت و تربیت

ان پر ناشر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع
پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر
اصلاح اور منتقل تربیت کے لئے صاحب دعوت نے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی
ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور منتقل تربیت کا ہیں نہیں ہوتیں، جہاں

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے ان مجالس کے شرکاء و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں پھر کبھی نہ آئیں یا ہمیشہ آتے رہیں لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شکاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسرہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو اور اس کے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیز وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا جہایت (تحصیل و حصول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فرض سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان تو ہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور ریاست کی آمیزش پاتی برداشت نہیں کر سکتی تھی اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ ناسپ پیغمبر ان کی دینی نگرانی اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلہ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفس گرم سے پھر ایمانی حرارت گرمی محبت، خلوص و للہیت جذبہ اتباع سنت اور شوق آخرت پیدا کر دے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کر انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھیں ہاتھ سے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و اعتساب و اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگان خدا کو حقیقت ایمان اور درجہ احسان تک پہنچا دیا ہے، اس سلسلہ زریں کے سر حلقہ اور کل سرسبد حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس طبع نبوی کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دور انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستے سے کام کیا ہے، اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلاویز شخصیت، خداداد روحانی کمالات، فطری علو استعداد اور ملکہ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر ہے آپ سے پہلے وہ اثنائے دن و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا، اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا، جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جادہ اور سمارٹ میں اور دوسری طرف افریقہ کے براعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاه وجزاه عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پراثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی نایب الہی آپ کی ذات آپ کے کمالات آپ کی تاثیر اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیب نفس اور تعلق مع الشریعہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت ہے اور اس کا خزانہ عامرہ کبھی جواہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۱۵۶۱ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں:-

• جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادہ شیخ عبد الوہاب نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد اس پر عمل کروں، فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرنے، رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو، اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو، اور سب کچھ اسی سے مانگو، خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو، توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے، اور فرمایا جب ل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے، اور فرمایا میں مغز بے پوست ہوں، اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں، میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں، ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو، یہاں بڑی رحمت نازل ہے، ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ بار بار فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے، اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے، بسم اللہ! آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے، اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارے کارساز تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس دن جس کی شب کو آپ نے رحلت فرمائی، ایک بڑی سخت پیغمبری تھی، اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبد الرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے، اور فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طوف رجوع کرو، اور صفت میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امر حق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور آپ نے فرمایا، میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مجھے کسی پرتیاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الہی میں پلٹے کھارہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے، اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے، اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہو جاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا، اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں، جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبار نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے، اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی، اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تَعَزَّزَ" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا، تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تَعَزَّزَ" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی، اور زبان تالو سے چپک گئی، اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ و اس صلاۃ

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوس و اخلاق کے مربیوں

کی ایک جماعت چھوڑ گئے جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور بڑھتی ہوئی مادیت اور غفلت کا مقابلہ کرتے رہے۔

اے حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و صلحین نے دعوت و تذکیر اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور عسویت جاری رکھا، اور غفلت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بندہ اور شیخ ابوالنجیب سہروردی کے بھتیجے اور تالیف شیخ الشیوخ ابو نعیم شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۵۹ھ - ۶۳۲ھ) سب زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے، جو طریقہ سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب "عوارث المعارف" کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں: لم یکن فی عصر عمرہ فی عصرہ مثله وكان شیخ الشیوخ ببغداد (آخر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی) اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے (ابن النجار کہتے ہیں: "انتهت الیہ الریاسة فی ترمیۃ المریدین ودعاء الخلق الی الله") (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلافت تھے) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں: وكان له مجلس وعظ وعلی وعظه قبول کثیر وله نفس مبارک (وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انعامات سے لوگوں کو بڑا نفع تھا۔)

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب "عوارث المعارف" کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد خلفاء عطا فرمائے جنھوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی الحاشیہ) اے وفيات الاعیان ج ۲ ص ۱۱۹ (النهضة المصرية) اے مرآة الجنان طبعی ج ۲ ص ۱۱۹

اے وفيات الاعیان ج ۲ ص ۱۲۰ اے نواب صدیقی حسن خان مرحوم لکھتے ہیں: در تصوف سنی کتاب بہتر از عوارث

نیست "تقصیر جمود الاحرار" ص ۶۳

علامہ ابن جوزیؒ

عبدالرحمن ابن جوزی دعوت و اصلاح کا ایک دوسرا نمونہ ہیں وہ اپنے زمانہ کے یکتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیفات اور علمی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

شہرہ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۷ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا ان سے حدیث سن کر قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتاب کی اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جوابات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا، دوسرے رات کے دجلہ کے کنارے کھیلنا کرتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ الگ ٹھلکے بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے خلوق کی احسان مندی سے بچایا۔^۱

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض موزنین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور برادہ سے گرم کیا جائے جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں جمع ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ بچ رہا۔^۲

ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالا مال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، "صبیہ الغافل" میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:-

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح ریز نہیں ہوتی، جب

کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رفیق نہ ہاتھ آگیا، اگر میں کہوں کہ میں بیس ہزار

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علومِ نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطحِ پست معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبہ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔

تصنیف و تالیف اور تحریر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں تو ہزار تک پہنچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشاء و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوقِ عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ اور ذوقِ عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسر ابو المنظر کہتے ہیں کہ وہ ہر سہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر ہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو ذوقِ صحیحہ حاصل تھے، اور صلاوت، مناجات و لذتِ دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشمِ بینا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیتِ خاطر اور تعلق

محشر کو سرمایہ زندگی سمجھتے تھے، اور اس میں کمی آنے سے بچپن مضطرب ہو جاتے تھے، صید الخاطر میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ابتداءً عمر ہی سے میرے اندر طبعی زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، رفتے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سرلیح الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور انس اور دعائیں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہل کاران سلطنت میری حسن تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے، اور انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بُری نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے باحالتیں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی، جتنا میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورت حال سے میری طبیعت میں ایک بھینسی پیدا ہوئی، اس بھینسی کا اثر مجلس وعظ کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی بچپن اور متاثر ہونے لگے اس بھینسی کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بد قسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صاحبین کی قبور کی زیارت کی، اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا، جس سے

مجھے وحشت تھی اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا۔ اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خواب غفلت سے بیدار ہوا اور میں نے اپنے مہربان و شفیع آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا۔

ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا و دولت عافیت اور دولت جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موثق عبد اللطیف کہتے ہیں کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدینی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موتوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ قراخ دست اور باحرمیت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں معین ہیں، "صید الخاطر" میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بد پرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، بلیس بلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور تشددانہ عجیب رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور حوصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے پست اور محدود نظر آئی ہے، "صید الخاطر" میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

”انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے، اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے پھر بھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صفت اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پرواہ نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے، لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطلع نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتانا تھا کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند، نفس بندیوں کا حلیں، اس سبب سے ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری نسلیں کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام لوں گا، اس لئے کہ گناہی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب غورہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب اہم مسئلہ ہی کی سیخ کنی کر دی، اور وہ مسئلہ آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دیوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگانِ خدا کو قتل کیا یہاں تک کہ اس کو بنیادی لذتوں کا ایک
 قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز
 ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا اور
 (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بری حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح منتہی نے اپنی بند
 ہمتی اور حوصلہ بندی کا بڑا نرا دکھایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے
 یقین ہے کہ پہنچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ موضوع
 ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی
 اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور
 دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقیہ
 حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا
 عمل ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمیع ہو جائے، پھر یہ بتا
 قصانیت کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگانِ خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے پہننے کے
 مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا
 احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، درآئیں ایک علم کے ساتھ اشتغال کسب معاش
 سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے سلوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا
 نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے تا کہ یہ سب میری
 یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ
 اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طبیعت و

مستحبات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدا رہ ہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر خصت اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں، جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں، اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن مال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آئینہ ڈالے، اور وہ بالکل محفوظ ہو، اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عذریہ، احتیاط و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تاسف درج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت مالا موت کا انتظام کیا جائے تو زہد و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی و رضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعثِ تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سالس بھی کسی لایعنی کام میں صرف ہو، اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ و ربہ نیت المؤمن خیر من عملہ^۱

مجالس و عطا اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز موعظ اور مجالس درس ہیں، ان مجالس و عطا

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد و شوق میں گریبا پھاٹتے، لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھریاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیش ہزار یہودی عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی تھی۔

ابن جوزی نے اپنی مجالس وعظ میں بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی، عقائد صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے وعظ و درس اور تصنیفات سے بہت فرغ ہوا، اور خلیفہ وقت اور امراء بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں مسلک سلف اور طریقہ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

”کتاب الموضوعات“

یہ موضوعات حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے جن سے اس زمانہ کے اہل ہوی یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

صد ہا غلط فہمیوں کا باعث بنتی تھیں اس طرح انھوں نے اس شاخ پر تیشہ چلایا، جس پر اہل بدعت نے
 اشیاء بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے، اور انھوں نے کہیں کہیں سخت
 فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

تلبیس ابلیس

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے، جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی
 نمونہ ہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے
 ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور
 غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے، اور دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے اور
 کن کن راہوں سے اس کے عقائد اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور
 کسی شخص کی رعایت نہیں کی، اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علماء و محدثین فقہاء و واعظین ارباب
 شعراء، سلاطین و حکام عباد و زہاد، صوفیہ اہل دین، اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات
 مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعت نظر زندگی سے واقفیت، باریکی بینی اور
 دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسانیت کا گہرا مطالعہ
 کیا تھا، اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں، اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں
 عجلت اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں بڑے بیش قیمت

اقتباسات اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں اور اگر ترجمہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے اور اس فن میں مونثکافیاں کرتے رہتے تھے۔

”ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی غور و فکر میں ہے، انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالہ نجاست اور متغیر کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اخلاقی مسائل اگرچہ علوم شریعت سے خارج نہیں، مگر حصول مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کر لے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاقی پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو، قاضی شریک کے موفیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔“

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پرنکلف عبارت بولتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے۔
 اس زمانہ میں ’واعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور‘ یوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے۔
 قرآن کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر کبھی نہیں ہوتا، ایسے واعظ سے
 ایک زانی ایک سود خوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیلئے ہو سکتی ہے اور کب عورت کو شوہر کے
 حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ واعظ ان
 مضامین سے خالی ہوتے ہیں ان واعظوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے اسی لئے ان کا
 بازار خوب گرم ہے اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے اور باطل ہلکا اور خوشگوار^۱
 آگے لکھتے ہیں۔

”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور شیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت
 کر چکی ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ سچا
 واعظ اس کی قائم مقامی کرے یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا
 ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی^۲۔
 یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ:-

”اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو
 اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے اس لئے کہ مخلص علماء اور مدرسین کی مثال اطباء
 کی سی ہے جو بوجہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا
 ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے^۳۔

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”یہ حضرات شریعت کے مقابل میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے اس کو مکملہ اور تسمیمہ کی ضرورت ہے اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے اس لئے کہ شریعت سیاست الہی ہے اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا فَعَلْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے کہ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے۔“

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مخالطہ کا ذکر کرتے ہیں:-

”معاصی پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلیب کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور ان سے وہ اپنے حق میں مدعا میں کرتے ہیں شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اسے گناہوں کا پلہ الٹا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا دفع نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس گزرا، اس جنگی وائے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مرد صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان سے واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار جنگی وائے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تمیز کی، اور کہا کہ آپ کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوادیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ جنگی کاناجا زور و پیہ وصول کر کے رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سُن لی جائے گی اور ہزار کی نہ سُن لی جائے گی۔“

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ "ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلافت شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں کی عقیدت و محبت ہوتی ہے اور ان پر وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں، جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بارہوتا ہے اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں اور وہ اس خرچ کرنا انسان کو بڑا باارز معلوم ہوتا ہے لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا یہ بھی ان کے لئے گویوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمہ ریاست ہیں۔

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک لدنیاء و لیشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں یہ لوگ اگر سب بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکالے اور خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ یہ تارک لدنیاء وہ طالب دنیا یہ اچھی غذا ئیں کھاتا ہے نہ شادی کرتا ہے حالانکہ محض جہالت ہے اور شریعت محمدی کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے پاك صاف چیزیں کھاتے اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔^۱

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونامی سب کچھ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفل خیر میں شرکت اور رقت ہے اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے تو یہ سنا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے میں ذاتی طور پر بہت آدمیوں کو

جانتا ہوں جو سالہا سال مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور روتے ہیں متاثر ہوتے ہیں لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں ارکان صلوٰۃ سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں مسلمانوں کی غیبت والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں شیطان نے ان کو یہ چل دی رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ بکاؤں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صاحبین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے بہتے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کر دیتے ہیں اگر رضائے الہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک یواری بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔ اسی طرح سے رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بتیاں بھیجتے ہیں حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔“

”صيد الخاطر“

”صيد الخاطر ایک تشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات بے تکلف خیالات زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلب بند کئے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

اعتراف کیا ہے اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، لوکروں اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں اور مفید ہدایت روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراضِ نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صد ہا کام کی باتیں ہیں اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں اور یہی ایک عامی اور ایک صاحبِ نظر میں فرق ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-
 ”میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور دونوں کچھ کا رہے ہیں، ایک مصرعہ پڑھتا ہے، دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے، دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے، یا اسی طرح کے مصرعے سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر مست البقا ہے اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں مشغول ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بوجھ اٹھا رکھا ہے اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستہ کو تسلی اور نفس کی جائز دلدادگی کی مدد سے قطع کیا جائے جیسا کسی شاعر نے کہا ہے کہ "رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کرلو۔"

اسی طرح کی حکایت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اوران کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں پانی پی لیں، بشر حافی نے کہا کہ اگلے کنویں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشر حافی نے آگے کے کنویں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو پہلائے گا، اور اس کی دجوبی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا ہے گا تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے بعض بزرگان سلف فرماتے تھے کہ اے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر یا زید بیطامی کا قول ہے کہ "اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھائے لے جاتا اور وہ روتا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہئے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاطفت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو محلہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پروا نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم

ہوا اگر شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں، اس لئے کہ مقامی کتے موٹے موٹے بدن اور
 بھدے اعضا کے ہیں، ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا
 ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے، اسی طرح ان کے عادات ہند ہیں، وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا
 مجال ہے کہ اس کو منہ لگائیں، مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکر یہ میں وہ اس شکار کو
 جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں، اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت
 ہوتی ہے، اگر وہ لطیف ہے، تو یہ بھی لطیف ہیں، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا
 جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا، اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے
 سرفراز کرے، اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا، جو ایمان و عقل سے محروم ہو، اور وہ اس کو
 قابل التفات نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے، اور یہ دوسرے عالم میں وہ دنیا
 کی بنا پر حسد کرتا ہے، اور اس کا مطمح نظر آخرت ہے، اور دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں، اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ
 کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صاحب بزرگ دعائیں شریک تھے، دعا قبول ہوئی،
 لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی، میں نے دعا کی، او
 اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح اور اہل خیر بھی میرے ساتھ دعائیں شریک ہو گئے، میں قبولیت
 کے کچھ آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو، لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے، لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے، مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے، اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے، اور کبھی اعتراضِ تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد و موثر ہوتا ہے، اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں، وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں، تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن فی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسنِ عمل پر پڑے، اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو اے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑ وہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے، مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے، پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے، اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے، اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا تو اعتراضِ تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔^{۱۵}

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش و پیش و عقبی نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں، اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اتر کی طرف رجوع کیا، اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمائے، اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورہ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے

وہیں سے شروع کیا وہ خیال دل پر مستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہونچا: **عَالَمًا مَعَادًا** اِنَّا سَرَّيْنَا لَكَ اَحْسَنَ مِمَّا سَأَلْتَ "تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہہ دیا تو نے خیال کیا ہے حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچ گئے، انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ وہ غلام تھے، نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی کہ **اَحْسَنَ مِمَّا سَأَلْتَ** "مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کرو تو حقیقت غلام ہے، ایسے آقا کو تیرے وجود کے وقت برابر تیرے ساتھ احسانات کرنا رہا، اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں تھا یا نہیں کہ اس نے کس طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے دینی دینی تیری حفاظت کی، تیرے اسباب ہیا کئے بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر مکر و دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہر کی ساتھ باطنی ذکاوت و وجود طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تفسیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھے تک پہونچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحت اعضاء کا یا سلامت مزاج، یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور ذرات ابتداء سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور مستدل راستے کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور اغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلیدِ جاد سے نجات کا

یا بتدریج کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، "وَإِنْ تَعَدَّ وَإِنَّمَا اللَّهُ
لَا تَعْتَدُوهَا" کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے نیکو
نے تجھ کو سبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سر بلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور
تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شاد کام اور فائز المرام ہے اس حالت
میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی
مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پورا
نہ ہونے ہی میں حکمت الہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں
پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے
معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں نے
کیا ہے، ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے
زیب دنیا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، "مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنُ مَنَاقِبِي إِنَّهُ
لَا يُضِلُّهُ الظَّالِمُونَ"۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا، جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور
دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی،
اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندہ درگاہ اور معتب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی،
میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرہ فقہاء سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے
سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اول تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کرتا کیوں؟
میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات
یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر
یہ اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ ہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے میں نے
کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کر لے، اور فرم کر لے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے وہ بالاجماع جائز ہے تب بھی
برائے وسیع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و
شوق پیدا کرنے کے لئے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، تبلیس
ابلیس اور ”صید الخاطر“ دونوں میں فقہار و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں،
اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، ”صید الخاطر“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و شغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے
لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا
مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ مؤثر
نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے
کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل مکمل اور ظاہری نہ تھا،
بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب باب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ علمی تجربہ اور

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبہٴ فن حدیث کی ساری توجہ اونچی سند حدیث اور کثرتِ مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام تر توجہ جدیدیات اور جرین کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تفصیل میں سلف صالحین اور زہاد امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔

صلحاء امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صالحین اور صلحاء امت میں سے بہتے متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصریؒ، سیدنا عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت ابراہیم بن ادہمؒ، حضرت بشر حافیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، حضرت معروف کرخیؒ، ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ صفۃ الصوفیہ لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب طلیۃ اولیاء کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فن تاریخ کی اہمیت و ضرورت

۱۔ صید الخاطر ج ۲ ص ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹،

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگزاشتیں ہوئی ہیں جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایان شان نہیں اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کا باعث ہو، "صدیخا ملر" میں لکھتے ہیں:-

"فقیر کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو تاہم ہوا حدیث لغت ہو یا دوسرا فن اس لئے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلیؒ اور قاضی شریک ایک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم، ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی اس لئے حضرت علیؑ نے سیدہ کو غسل دیا، میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے، پھر حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کے بعد ان کی بھانجی ام ربیعہ زینبؑ سے نکاح کیسے کیا، اسی طرح میں نے امام غزالیؒ کی کتاب حیا العلوم میں اسی تاریخی فروگزاشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا، میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے، جس کو انھوں نے مستظہر باشہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبد الملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکات بھیجو، انھوں نے ان کے پاس آجلا ہوا پوکر بھیجا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا، پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا، اور اس سے عبد العزیز پیدا ہوئے، عبد العزیز کے عمر بن عبد العزیز پیدا ہوئے، یہ سخت مغالطہ ہے، اس لئے کہ انھوں نے عمر ابن عبد العزیز کو سلیمان بن عبد الملک کا پوتا قرار دیا، حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے، شیخ ابوالعالی جوینی نے اپنی کتاب "اشمال" کے آخر میں اصول فقہ

میں ہے، لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقل ہے کہ حلاج، بخالی قرمطی، اور ابن المقفع نے سلطانوں کے نظام کے القے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استالت کی سازش کی، اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کا ذمہ داری لے لی، بخالی نے احسا میں سکونت اختیار کی، ابن المقفع ترکستان کے حدود میں جا بسا، اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا، اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے، اور بڑے مردم شناس اور فہم ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقفع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقفع کے قتل کا منصوبہ حکم دیا تھا، اور یہ ۱۳۴ھ کا واقعہ ہے، درانجی ایک البوسیدہ بخالی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا ہے، اور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قرمطی اور حلاج کا زمانہ قریب قریب، لیکن ابن المقفع بہت متقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے، اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو، اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی محبوب ہے، کہ کسی واقعہ کے تعلق اس سے فتویٰ لیا جائے، اور وہ جواب دے سکے، اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے جمع کرنے میں مشغول ہے، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوتی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے، اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے، جو پست اور بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے۔

تاریخی تصنیفات

انہوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک مبسوط کتاب المنظم فی تاریخ الملوک لکھی

لکھی جو دس جلدوں میں ہے اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر ۱۵۷۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے مصنف پہلے سن لکھتے ہیں، پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سن میں جن ممتاز اور قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے، ان کے حالات بیان کرتے ہیں، اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب تلخیص فہوم اہل کافہ فی عیون التاریخ والسیر ہے جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی مجالس و عطا کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خدا داد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب، اس لئے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار شدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں اور لوگوں سے بالکل کیسو ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو

لے اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرة المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ لے یہ کتاب ہندوستان میں

مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

ہٹایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ القادشیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چوریہ ہے کہ وہ بیکاری اور عطل کو پسند کرتا ہے اور جدوجہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے اس لئے کہ عزت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادہ عوام اور عمومی دعوت کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۱۹۵۹ء میں شب جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے، جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔



نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکز اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور دوسری طرف عظیم شخصیتیں صلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے، اور مسلمانوں کی ہستی اور نفس اسلام کا وجود زرد میں تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے تارکھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، دیر کے اشتعال اور جذبہ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقت ور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پران کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب اس کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے بلکہ قی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا، جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوا بیوں سے آگ لگا دی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع وزیر خیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب محرکات جمع ہو گئے جنہوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔

بہر حال ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں کے پہلے شکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے شکر نے الرہا (ایڈیسا) اور ولایت انطاکیہ کے بڑے شہروں بہت سے قلعوں اور حلب پر قبضہ کر لیا، ۱۱۰۲ء مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی مبارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انططوس، عکہ طرابلس الشرق اور حید اصلیبیوں کے تصرف میں آگیا، مشہور انگریز مورخ سیٹنلے لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھٹیاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلہ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”بیت المقدس میں فوج تیار داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچا یا کہ بیان کیا جاتا ہے، کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (معبد) میں زندہ جلا دیئے گئے“

”دوسرے دن اس سے بڑے سپاہ پران رزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹینکر ڈنہ تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ جیتنا چلتا تاربا، اور ان سب کو باہر لا کر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر لگے تھے، بالآخر یہ سفاک قتل عام اختتام کو پہنچا شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھوا لیا گیا“

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

اس کی فوج طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی بھئی، شام و فلسطین میں مستقل چار سیانی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مکرر اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ رنجی نالڈ والی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور روضہ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعہ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بد نظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو، اور جو عالم اسلام کی کچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، سنیلین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوک (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک، نظم کا تھا جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر یکجہت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں۔"

اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔
لین پول لکھتا ہے:-

”مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں، اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دیر اور ہمت اور جنگی قابلیت کا سب سے بڑا نمونہ ہو، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جوانمرد اور جنگجو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا۔“

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردہ نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا ابا القی (آبا بک) اور سلطان کی طرف سے مصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الہا (ایڈیا) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، جہادی الاخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۳ء کو اس نے الہا پر قبضہ کر لیا، عرب مورخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتداء کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نور الدین زنگی نے بہت آگے تک پہنچا دیا۔

الملک العادل نور الدین زنگی

نور الدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس

کے باز یافت کے لئے اپنے کو مامور من الشہر سمجھتا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حملوں سے تمام سچی ریاستوں پر دھاک بٹھادی تھی۔ ۵۵۹ء میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ ثواب طرابلس مع دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے، اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید اس قبضہ کے بند قلعہ بانیاس فتح کیا، ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا، لہٰذا لکھتا ہے :-

”نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا روڈیل پر قابض ہو جانا یہی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آگئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دیماط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہو گیا، اور انھوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔“

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نور الدین کے حسرات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۵۶۹ء مطابق ۱۱۷۳ء کو چھپن برس کی عمر میں بیمار صہ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ سلطان نور الدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے۔“

نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل، دیانت، تقویٰ، حسن انتظام، شرافت، نفس، محامد اوصاف

اور جذبہ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا ”مدوح“ و ”محمود“ ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ السنن میں لکھتے ہیں :-

جاهد الشغور وانتزع من ایدی
الکفار شیفاً وخصم سین مدینة، وکان
سیرته اصلح من کثیر من الولاة والطر
فی ایامہ امانة والمحامد له کثیرة وکان
یتدین بطاعة الخلافة وترك الملک
قبل موته وکان یحیل الی التواضع
ومحبة العلماء واهل الدین^۱۔

نور الدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ
سے کچھ اور پچاس شہر آزاد کئے ان کی زندگی اکثر
سلاطین و حکام سے بہتر تھی راستے محفوظ تھے،
ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں وہ خلافت بغداد
کی ماتمی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے اتفاقاً
سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کر دیئے
طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی اور علماء و

اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاط و احتیاطی لے لیا اور اپنی ملی تعریف میں مشہور ہیں لکھتے ہیں :-

وکان کاعاداً لآخر اعداء اعداء اورعاً
تمتک بالشریعة مائلاً الی العید مباحداً
فی سبیل اللہ تعالیٰ کثیر الصدقات^۲۔

وہ ایک نصف ازاد عابد متقی، متبع شریعت
سلطان تھے اہل شیعہ کی طرف بڑا میلان رکھتے
تھے اور جہاد فی سبیل اللہ کا خاص اہتمام تھا
کثرت سے صدقات و خیرات کرتے شام کے تمام
بڑے بڑے شہروں میں مدارس تعمیر کئے ان کے قریب
یادگاروں اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔

ما یتغرق الوصف^۳۔

تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر حزری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ :-

وقد طالعت سير الملوك المتقدمين میں نے گزشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا
 خاتمہ ارفہا بعد الخلفاء الراشدين وعمر مطالعہ کیا ہے، خلفاء راشدین اور عمر بن عبد العزیز
 بن عبد العزیز احسن من سیر الاولاء اکثر کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ
 محموداً منه اللحدل! عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”وہ صرف اپنی اس جائداد کی آمدنی سے کھاتے پیتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو فروخت کر کے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں خرچ کے لئے دے دیں، جو محض میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس دینار کے قریب تھی، جب بیوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ میرے پاس دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں... اس امانت میں خیانت کر کے تمہاری خاطر جہنم میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔“

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی تہیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی، مصر و شام، جزیرہ موصل سب جگہ اس کو موقوف کر دیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہو گئے، اور ناصی صاحب کو کہلا بھیجا کہ میں عدالت میں حاضر ہو رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدمہ میں ان کو کامیابی

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضری نہ ہونے کا سبب میرا کثیر ہو، اس لئے میں حاضر ہو گیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دارالعدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر ظلم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ، ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان ختم تھی، وہ جنگ میں دوکانیں اور دوترکش ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ یہودی ہر حق ہے لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس نواضع و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و اب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کی یہ کتاب متحمل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے۔^۱

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دیکھی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۵ھ میں نور الدین کو حصن الکراد کے معرکہ میں (جو بقیعہ کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کر دینے کی وجہ سے شکست ہوئی، نور الدین حص کے قریب شمن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا انتخاب دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا، مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر سوار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پروا نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریاہ دلی سے اہل لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقراء، فقراء اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرت الہی کی امید انہی فقراء و صغفرا کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کروں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں، جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانحالیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں جب مجھے دیکھتے ہیں اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں کبھی نشانہ پر لگتے ہیں ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں؟

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پراثر خطوط لکھے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلیحاء و فقراء کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رورو کر لوگوں کو خیر خطوط پڑھ کر سنائے اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوش جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، وایان ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں لیکن

سلطان نے اپنی نذر پوری کی اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔ نور الدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاس کے محاصرہ میں اس کے بھائی نصیر الدین امیر ایران کی ایک آنکھ جاتی رہی نور الدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آجائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے تو تم کو تمنا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آجائے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشو و نما ہوا مگر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد و نوجوان لے اکال ج ۱۱ ص ۱۲۲-۱۲۳ ۱۲۴ ایضاً ص ۱۲۳ ۱۲۴ سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابوالیوب نصاریٰ سے ہے سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کر دے یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

۱۲۴۵ء ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائیجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے ان کا تعلق قبیلہ ہذانیہ کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شاوی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیر کوہ اسد الدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے اس کے بعد کمریت میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شادی کا انتقال ہوا کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کو توال شہر کے علم میں داخل ہو گئے جو سلطان مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی

سے متعلق ہو گئے اور قلعہ "بعلبک" وغیرہ کے محافظ بنادیتے گئے، (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابو حیدر ص ۶۱-۶۲)

بیت المقدس کا فاتح اور عالم اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفاء اور صلحا کے لئے قابل رشک ہے، اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا جس سے روح مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پولی لکھتا ہے کہ ”بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے، وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پُر امن نیکی کی بنارہا، جو شریف طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے۔“

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے دلی نعمت نور الدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہار الدین ابن شداد سلطان کے مخدوم لکھتے ہیں کہ ”سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا بالکل سیری مرنی سے نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے ”وَعَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ“

زندگی میں تبدیلی

مصر پہنچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا، اور مصر کی زمام مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی کیسے بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہار الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ ”حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آ جانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں بھیچ ہو گئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب کے توبہ کی عیش و تفریح سے منہ موڑ دیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔“

لین پول بھی یہی لکھتا ہے:-

”اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیے متقی اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر اب ان میں اور سختی اختیار کی دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود ایک مثال بنا، اس نے اپنی تمام بلینے کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت قائم کرے جس میں کہ کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا ”جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دینا منظور ہے“

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر عمر تک سلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔^۱

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذتیں اور اس کی روح کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ:-

”جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا، یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اسباب و سائل پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد اور اہل خاندان اور وطن

سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے، مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

”سلطان صلاح الدین نے اپنا خیمہ رمالی کے میدان میں نصب کر لیا جب خیمہ نصب ہو گیا، تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں، بادشاہ گالی اور ریکی نالہ چاٹیلون (حینن) دونوں اندلائے گئے، سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور اُسے پیاسا دیکھ کر ریت میں سر دکے ہوئے پانی کا

کٹورا دیا، گالی نے پالی بیا، اور پانی کا کٹورا والی کرک ریجی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناتواں ہوا اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گالی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جیسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین اتا کہہ کر کھڑا ہوا اور ریجی نالڈ کے سامنے آیا، ریجی نالڈ جب سے خیمہ میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن! میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھالی تھی، ایک مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے کہہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغا بازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا، دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جلیا کہ عہد کیا تھا، ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رقم باقی تھی اسے پہرے والوں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گالی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گزر گیا گزر گیا۔^{۵۲}

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریجی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ ھا نا انتصر لمحمد علیہ الصلوٰۃ والسلام، (لو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔^{۵۳}

لے قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جہاں بکس حجاج نے اسے انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں، یفرہ صلاح الدین کو پہونچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے

ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا۔^{۵۴} سلطان صلاح الدین سے^{۵۵} ۱۲۸۵ھ النوار السلطانیہ ص ۶۴

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آگیا جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی، یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

۱۵ سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پاؤ اس کے متعل نہیں تھے۔

اسی سال ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء ۲۷ رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پورے ۹ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولیت میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی جس تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔ قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

۱۵ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل حرفہ اور اہل طرق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی سمجھے نہیں جا سکتے، ہر طرف دعا، تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبة صخرہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالیٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ عیسائی مورخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

”صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نامٹ ثابت نہیں کیا تھا، جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یہوشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران زمرہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی دفعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا، کہ ہر شہر والے کو جو زبردیہ ادا کر چکا ہے، یا ہر جانے دے؟“

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے: ”اب صلاح الدین نے اپنے امیروں کو کہہ دیا کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرنا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں سناٹا کر دیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زبردیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب المعزز سے نکلے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی، جو صلاح الدین نے بیشمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔“

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس متلوچ مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا، جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحیائے حرکتیں یاد آتی ہیں، جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یہوشلم کی فتح پر کی تھیں جب گوڈجے اور نکیر دیو سلم کے کوچ و بازار میں گئے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جان بلب زخمی لوگ تھے، جب کہ

بے گناہ اور لاجپاسلمانوں کو ان صلیبیوں کی سنت اذیتیں دے کر مارا تھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں
 قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انہیں اپنے تیز وں چھید کر
 گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بڑھ لگایا تھا، جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و
 بدنامی کے رنگ میں انہوں نے رنگایا تھا، جہاں رحم و محبت کا وہ عطا جناب مسیح نے نہایا تھا، اور فرمایا تھا کہ
 خیر و برکت والے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے، اس وقت
 وہ ان کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں
 ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفات خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفت رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں
 عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یر و ظلم کو
 باریاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ
 تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں کیتا، اور بے مثل شخص تھا۔

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور خطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک
 اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ابل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، اور
 مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر، فریڈرک، رچرڈ شیردل، شاہ ان انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریا

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نائٹ اپنی آپس پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابل میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے۔

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خون آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں جریضوں میں جو ٹھنک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عک کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگین تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:-

• جنگ مقدس خانہ کو پہنچی پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۹۲ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریا سے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک بچہ زمین بھی رہی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے، تو صور سے لے کر یافک ساحل پر بجز زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی تلقین ضرورت نہ تھی، صلیبیوں کو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ افرنجیوں کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان مال کا لحاظ کیا جائے، تو یہ نتیجہ نہایت حقیر تھا، پاپاے روم کی فریاد سننے ہی پر کل سبھی دنیا نے ہتھیار اٹھائے تھے، قیصر فریڈرک شاہ ان انگلستان فرانس و متقلہ آسٹریا، کالوپولڈ برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈرز کا کاونٹ، صدمہ مشہور و معروف بیرن اور تمام عیسائی قوتوں کے مالک، شلم، عیسائی بادشاہ اور قسطنطین کے دیگر عیسائی و ایوان ملک طبقہ داویہ اور طبقہ ابطار کے بڑے بڑے شہسوار، ان کو شمشیر میں مٹا دیا، ہونے کے بہت بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو ٹھٹھنے کے قریب ہے، پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا؟ اسی دوران میں قیصر فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان، فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھالے اور ان کے بڑے بڑے شریف اور معزز ساتھی ارضِ ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحلِ عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ تیسری جنگِ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹٹوٹنے سے نہ رکھی، صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی محنتوں اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی، مگر کسی زبان پر حوت شکایت نہ تھا، کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں نکلنے کے سلطان کے تابع والیان ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی لگ کر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن ہر کیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے آخری جنگ جو ارسوف پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانیازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔ اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کہ ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے، اور طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشموں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شہرہ شکر بنا رکھا تھا کہ تمام لشکرتن واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رکن رہے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود یا فاپر فوج کے تردد کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۳ء کے موسمِ خریف تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۷ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باغ گزار ریاست نے اس سے بغاوت کی، اگرچہ توقعات ان کی غیر خواہی اور بغاوتی سے رکھی گئی تھیں، وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط اعتقاد و قیادت کی طاقت کو بھی آزمائش میں لا کر ہر ادیتیں، صرف غرق میں سلطان کے ایک عزیز کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً معافی لے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثناء اس اثر کو اور قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا، جب جنگ پانچ سالہ کا یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہوئیں تب بھی سلطان کوستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبت تک بذات واحد حکمران رہا، اور ان حدود سے بھی دور گردنا کا بادشاہ ارمینہ کا کاٹلین (حاکم وقت) قونیہ کا سلطان اور قسطنطنیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے مبارکباد دینے البتہ حاضر ہوئے، یہ کل کشمکش صلاح الدین نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی عادل کے جو آخری زمانہ میں ملین طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی ایک پہ سالہ یا بیشتر کو بتا سکے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا میسر یا صلاح کا مددگار اس پر حاوی ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملات جنگ میں مشورہ دیتی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ سلطان کی صبح رائے پر اس کی غلط رائے غالب آگئی، جیسا کہ صورا اور نکہ کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی بیٹے، بھتیجے، پڑائے رفیق، ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، محتاط اور وفاتر معتمد وزیر، متعصب واعظ، اور ملا بھی اس میں متفق الکلام تھے کہ جہاد کیا جائے اور سب اس میں شریک بھی ہوئے، اور سب نے آقا کی بڑی تندہی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش فکر اور سخت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ
سلطان صلاح الدین کا تھا۔^۱

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے
کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ساڑھے ۵۰ سال
کی تھی، قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”۲۷ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بارہواں دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی اور قوت گھٹ گئی
شیخ ابو جعفر امام الکلاہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں
رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آگئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس
ہوں اور ان کو تلقین کر سکوں اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پارہ پا
ہیں شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول
اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے ”وَمَا أَفْعَاہُ
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ“ پڑھی تو سلطان کو ہوش آگیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ
آئی اور چہرہ کھل گیا، اور کہا صبح ہے، اور یہ کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ چہار خنبہ کا دن صفر کی ہفت روزہ
اور تبرکات کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں
کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت مچی برسی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا
ترسنا اور گھبراہٹ مچی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ نہ جانے

کی تمنا کرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ شخص ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے، اگر ان کے اسکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں، اور اس کی طرف سے فدیہ نہ دیا جائے تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔^{۱۵}

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک تینار اور ۴۰۰ درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائیداد، یاغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پوے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب، قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:-

”سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ و الجماعۃ کے ہم مسلک، ہم اعتقاد، نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ ساہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے جا نہیں پڑھی، حالت مرض میں بھی امام کو بلا لیتے، اور تکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن و رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو (شافعیہ کے مسلک کے مطابق) نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس کے انھوں نے کبھی انشاپس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہوا، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف ۴۰۰ درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائیداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند منع کیا، لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آوند تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا، لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پیرہ داروں سے دو دو تین تین چار چار پائے سن لیتے، بڑے عاشق، خاص، رقیق القلب تھے قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں کی آنسو جاری ہو جاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے۔ اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا، تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سننے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پر نہم ہو جاتیں، عین میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، دینی شعائر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انہی کے ایما سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کر دیا، ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کٹھن گھڑوں اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شب جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور مہیوست غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، فرمایا شاید تمہیں نیند نہ

محاسن اخلاق

عبادات و فضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو و حلم، جود و سخاوت، مروت و شرافت، صبر و استقامت، شجاعت و فتوت اور شہامت و علو ہمت کے اوصافِ عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ "ہفتہ میں دو بار دو شنبہ و پنجشنبہ کو اذن عام ہوتا تھا، فقہاء، قضاة و علماء اور اہل مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے امیر غریب، پورے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر و حضر میں بھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات و فرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحبِ فرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے، اس کی داد دے کر دیتے، اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا، لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور تحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "اپنے رفقاء و خدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی، لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرزِ عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ

نو بت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مر جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پی لیا۔

اور اس تاخیر پر کچھ نہ کہا، ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسلِ صحت کے لئے حمام میں گئے پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا، اور سارا پانی ان پر آگیا اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہ دو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی باز پرس نہیں کی، قاضی ابن شداد نے سردار ان فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگزر اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں۔^{۳۵}

”جو دشمنان کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دیئے آدھ فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسلان نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا، بعض مرتبہ سامان بیچ کر نواد کو عطا یا انعامات سے نوازتے، محافظین خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہوگی، تو وہ رہنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو دپیہ اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔“^{۳۶}

”مرؤت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، خواہ کافر ہو، صید کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی، اپنے ساتھ کھانا کھلایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی، اور اس کے فضائل و محاسن بیان کر کے اس کو اسلام کا ترغیب دی، اس مرؤت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں مبتلا اور پھل بھیتے رہے۔“^{۳۷}

۱۔ تاریخ ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین ۲۵۰ ایضاً ۳۵ النوادر السلطانیہ ص ۲۳۱ ۲۵۲ ایضاً ص ۱۳۱، ۱۳۲

۳۵ الفتح القسی فی الفتح القدسی عماد الدین الکاتب۔

”سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور درد مند انسان تھے، ظلم کو برداشت نہ کر سکتے تھے کسی آفت رسیدہ کمزور مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لا سکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیبانی بڑھیا ان کے پاس آئی، وہ سینہ پیٹی تھی، اور برابر روئے جا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خیمہ سے اٹھلے گئے، مجھے روتے پوری رات ہو گئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق و مہربان ہیں، ہم تمہیں ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں، تم ان سے فریاد کرنا، انہوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، ان کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں، اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی بچی کو خریدا ہے، جس نے خریدا ہو، اس کو قیمت دے کر اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ ہوا بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گر گئی اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر خوش خوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔“

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ جب سلطان کسی تیم کو دیکھتے تو محبت و شفقت کی باتیں کرتے اور اس کی دجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے، اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی عمر شخص یا بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے، اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے۔“

مردانہ اوصاف

صبر و استقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مکر سے گھٹنوں تک اس قدر دلنے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کر سکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صفت آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔

ایک معرکہ میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی پہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے کبھی جاگتے یہاں تک صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو لشکر کے راستے میں سب آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مسلح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھمسان کی لڑائی میں سلطان تین تہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کو تل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسرے تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرتے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر ٹھہرنے یا ٹہرنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی، انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلے میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی، ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اور لشکر

جہازِ عکہ میں آئے، میں عصر سے مغرب تک گنتا رہا، لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکہ کے رے بڑے مہم کے
 میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، اقلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طلشے زمین پر گر گئے، لیکن
 سلطان ہند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے، یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو لکھارا
 اور شرم دلائی، اور وہ میدان میں واپس آئے، اور دوبارہ حملہ کیا جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور
 مسلمانوں کو فتح ہوئی، سلطان کی بلند سمتی اور عالیٰ حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن خلدون کہتے ہیں کہ
 سلطان نے ایک روز فرمایا کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے
 کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں اور ہند
 میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہنچوں، اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے
 زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے، یا میں اس ارادہ میں کام آجاؤں؟

علم و فضیلت

سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ ان کے مشہور گھوڑوں کے سلسلہ نسب
 پران کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات ان کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادر کا ان کو علم تھا، ہر طرح
 کے معلومات رکھتے تھے، ان کے تہنیتوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں، بعض مورخین کا بیان ہے
 کہ ان کو ہمارے حفظ تھا، لہٰذا پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”اس کا اصلی رجحان طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سنتے، ان کے براہین اور
 راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآن کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر
 اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت و الجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے؟“

فاطمی حکومت کا زوال و اصلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں اقتدار عبیدی سلطنت (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۶۹۹ھ سے ۷۶۱ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا یہ دور حکومت اعتقادی عجائبات عجیب و غریب حکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پر تھا جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب المخطوطات سے پیش کئے جاتے ہیں:-

۳۶۲ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی اور قانون بنا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے

بچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؑ کے ساتھ عداوت

کا مراد سمجھا جاتا ہے ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا روزہ اور عید حسابے ہونے لگے۔

۳۶۴ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری مانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے

پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زرد کو بکایا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوٰۃ اضحیٰ

(نماز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں ملوخیاء (ایک ترکاری) کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب تھے، اس لئے ممنوع

قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، جرحیر کی اس لئے مانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت

عائشہؓ کو مرغوب تھی اسی سن میں تمام مساجد دیواروں، مقابر اور صحرائیں سلف کو متب و شتم اور

لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۴۱۱ھ میں الظاہر لا عزاز دین اللہ نے شراب کی عام اجازت

۱۰ محققین انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورث اعلیٰ عبید بن جوسی یا

یہودی تھا، قاضی ابوالکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب المکشف عن اسرار الباطنیۃ اور قاضی عبد الجبار نے کتاب تنبیہ النبوة اور

مقدی نے اپنی کتاب کشف ما کان علیہ من عیبہ میں اس پر تفصیل بحث کی ہے۔

دی عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرانی اور بیماریوں کا زور تھا، لوگ محل شاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ایک جگہ (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے، لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔ ۳۲۴ء میں ملی عہد کی جس کی عمر ۳۳ سال کی تھی، سواری نکلی تمام بازار آلات تھے، لوگ زمیں بوس ہوتے تھے۔ ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی، مستنصر بالله جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، آری احکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی، الفاروق بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاصد لدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہو گیا ۱۱ سال تھی۔

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جابجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے، رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا، مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر قمری لکھتا ہے:-

واختفى سذهب الشيعة والاسماعيلية شيعية، اسماعيلية اور امير کا مذہب پوش ہو گیا،
والامامية حتى فقد من ارض مصر كلها یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں ان کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دور ابتلا تھا جس میں مسلسل شرعیت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا، اہل سنت اور اہل علم مظلوم و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت، اوباش مزاج، اور بد دین غالب حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتين فی اخبار الدولتين میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

واقى هذه البلاد على الاسلام من اول عبیدوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ ہمارا

دولتهم الى اخرها وذلك من ذي الحجة
 سنة تسع وتسعين ومائتين الى سنة سبع
 وستين وخمسة وفي ايامهم كثرت الرافضة
 واستحكم امرهم ووضعت المكوس على الناس
 واقتدى بهم غيرهم وافسدت عقائد
 طوائف من اهل الجبال الساكنين بقعور الشام
 كالصيرية والدروزية والحشيتة نوع منهم
 وتمكن دعايتهم منهم لضعف عقولهم
 وجهلهم ما يتمكنوا من غيرهم واخذت
 الفرنج اكثر البلاد بالشام والجزيرة الى
 ان من الله على المسلمين بظهور البيت
 الاتاكي وتقدمه مثل صلاح الدين
 فاستردوا البلاد وازالوا هذه الدولة
 عن ارقاب العباد

اسلام پر سطر ہی اس کی ابتداء ہی کچھ عرصے سے
 ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ پر ہوا ہے ان کے دور
 حکومت میں رافضی کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا لوگوں
 پر محاصل اور ٹیکس مقرر کئے گئے اور دوسروں کی ان کی
 اقتدار کی شامی حدود پر بسنے والے کو ہستانوں نصیر یوں
 دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے، حشیشی
 (بھنگ استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قسم ہیں، ان
 اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کو ہستانیوں کے
 اندران کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا وہ
 دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دور حکومت میں
 فرنگیوں، شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر
 قبضہ کر لیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ
 خاندان اتاکی برسر اقتدار ہوا اور ملتان، العرب
 جیسے مجاہد سامنے آئے جنہوں نے اسلامی ملک زیر نوازیہ
 کیا، اور اس حکومت سے ہندوستان، خد کو نجات دی

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان
 اور مجتہدین سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے
 انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

انقرضت تلك الدولة وزالت عن
الاسلام بمصر باقرارها الدلة^۱
یہ حکومت ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ مصر میں
اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "الصواعق المرسلة" میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات پھر
نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پُر جوش الفاظ میں کیا ہے:-

"ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضاعف ہو گئی اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک کہ
وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی اور اس کے پیچھے جم گئے اور اس کے علمبراز مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے
پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہنچ گئے، انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انھوں نے
اور ان کے حکام وقضا نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل انوان الصفا
تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے اشارات اور شفا اور دوسری تصنیفات لکھیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ
میرے والد حاکم بالشہر (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مابین میں سے تھے، ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا چلن موٹا
ہوا، اور کتب سنت بالائے طاق رکھ دی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت
کا تمغہ امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا
قبضہ رہا، اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی مملکت میں ذمیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت)
کی طرح رہتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا، جو اہل سنت کو
نصیب نہ تھا، کتنے علماء اس دور میں قابلِ گردن زدنی ترزا پائے، کتنے وارثینِ انبیاء ان کے قید خانوں میں
پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

آخر غیرت الہی کو جوش آیا اور نور الدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باطنی
 ہتھیار غصہ چھڑایا، ان ملکوں میں اسلام کا دم واپسین معلوم ہوتا تھا، لیکن اس انقلاب سلطنت اسلام
 کو نئی زندگی عطا ہوئی، اور اس کا آفتاب اقبال گہن سے نکلا، اور رفتے زمین کے مسلمانوں کو اس سے ستر
 ہوئی، جب کہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دور ابتلا میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالیٰ
 نے اپنے بندے اور شکر مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستار ان صلیب آزاد کرایا اور اللہ اور اس
 رسول کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دین حق کی نصرت کا حق ادا کیا۔

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص
 اس اطلاع کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرت کا
 اظہار کیا۔

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدین صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر
 عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بد نظمی اور مغربی ترک تازوں کی ہوس کا شکار بننے سے
 صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بغاظمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے
 ایک چشمہ فساد کو بند کر دیا، جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا
 رہا تھا، اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا،
 تاریخ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی، اور کسی ملک کا
 مسلمان اس کردی مجاہد کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاء اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں ان کی علمی و دینی سرپرستی، جاہل دینی مدارس کے قیام، نیز شیعہ اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و علمی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ با عظمت شخصیت شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (م ۷۶۸ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرہ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عز الدین بن عبد السلام دمشق میں ۷۵۸ھ میں پیدا ہوئے، اساتذہ و مشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آدمی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلہ علماء و اساتذہ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انہوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر حاصل کر لیا، اور ان کے معاصرین ان کی علمی جلالت شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علامہ ابن دوق العبد نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۲۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبدالعظیم المنذری صاحب کتاب "التزغیب التزویب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جس شہر میں عزالدین بن عبد السلام ہوں وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عزالدین کا پایہ امام غزالی سے بلند ہے۔
ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:-

انتهت الیہ معرفة المذهب مع الزهد فقه کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل
والورع وبلغ رتبة الاجتهاد^{۲۲} تھا، اور درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ عزالدین بن عبد السلام نے عرصہ تک دمشق میں زاویہ غزالیہ میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور تردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدہ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

۱۔ طبقات الشافعیہ الکبریٰ ص ۲۴۵ حسن المحاضرة للسیوطی ص ۱۳۱ ص صلاۃ الرغائب ایک نماز تھی جو تائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۳۴۵ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عزالدین بن عبد السلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو اتحاف السعادی شرح اجاز ص ۴۴، نصف شعبان پندرہویں شب کو تترکعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع، منکر اور

سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عز الدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے یا وقار بارعب اور خود دار تھے انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا دربار داری کرنا گوارا نہیں کیا جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک عادل ابو بکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا، سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

لے چھٹی سائیس صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور خابہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہرگز وہ خوش نمی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا، اور رائی کا پہاڑ بن گیا، تحریف و تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عز الدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدہ و علما اشعری تھے، الملک الاشرف خابہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی

معلومات کے بعد اس کی بدگمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۸۵، ۸۶)

مجھے معاف فرمائیں میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پرس کرنے کا تعلق ہے میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں اور اس وقت سوتا ہوں جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ "فَعَنْ عَفَى ذَا صُلْحٍ فَاَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ"

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو رہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں ان کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں اس وقت آپ کا رخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنان اسلام کی طرف پھیر لیں اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سر بلندی کی نیت کریں اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں اور آپ کے نامہ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جلتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر وقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملك الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نابینا سلطنت اور اہل کاران حکومت رنگ ریاں کر رہے ہیں، شراب کے دو چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں، اور اہل معاملہ کی دادرسی کریں، الملك الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی مانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی محبت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصتہً لوجہ الشرحی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملك الاشرف کے جانشین صالح اسمعیل (ابوالنجش) نے الملك الصالح نجم الدین ایوب بادشاہ مصر کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور عقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلام نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حیاتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انھوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے قانع ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دشمنان دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسمعیل، الملک المنصور والی حمص، اور سلاطین فرنگی اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمعیل کے دل میں شیخ عبدالدین کی ناراضگی برا بھلا کہتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی اس نے اپنے عمائد و خواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمال کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامد نہ باتیں کیں، اور ان کی تعظیم و تکریم اور ان کی دجولی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیاز مند نہ لیں، اور اس کی دست بوسی کر لیں، تو فیصہ رفع دفع ہو جائے گا، اور آپ صاف و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب یا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار ہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاہ ان یقل یدی
اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ
فضلاً عن اقبل یدہ یا قوم انتم فی واد
میرے ہاتھ کو پورے چپ جائیکہ میں اس کی دست بوسی
وانانی واد والحمد للہ الذی عافانی
کروں، لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں
عما ابلا کعبہ۔ (طبقات الشافعیہ ص ۵۵)
خدا کا حکم ہے کہ میں اس آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کر لوں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہو سکے اسے دریاغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (هذا الکبر قوس المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعہ سپرد کرنے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھوکے پیئے۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسماعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزرنا ہوا تو والی کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ: ”تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

شیخ عز الدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک لصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدہ قضا اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صاحبیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عز الدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنت مصر کا منظم اعلیٰ تھا

لہ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۱۱ بروایت شیخ شرف الدین عبد اللطیف فرزند شیخ عز الدین ابن عبد السلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عز الدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مساجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخر الدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدہ قضا سے استعفا دے دیا اس کا روائی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدہ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفہ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطان مصر کا پیغام پہنچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطان مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطے سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخر الدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عز الدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہنچایا۔

ان کی جرات کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے ترک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دور و یہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب تسلیمات بجا لاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ ایوب ابداً کو تم کیا جواب دو گے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے، بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے وادعیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو، جن کا جواب یہ ہوتا ہے: "إِنَّا وَجَدْنَا النَّبَاءَ عَلَىٰ أُمَّةٍ" (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ ہمیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابل میں ایک بے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہنچ گئیں اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو استجاب دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہو گئے۔

مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثناء میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت مٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ پہلے اپنے محل کے جواہرات، اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکان سلطنت،

اور امراء دربار اپنی اپنی بیگیا کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون و چرا جو اہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلا ترک تھے اور سلطنت مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سر بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھروالوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاهرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہو گیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی، اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو مناکر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یس کر نائب السلطنت نے بڑے خوشاندانہ لہجہ میں ان کو اس راہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عمل کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، نگلی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو، یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر عرشہ طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا میں تمہارا نیلام کروں گا، اور تمہیں فروخت کروں گا، اس نے کہا کہ ہماری قیمت آپ کس میں صرف کریں گے؟ فرمایا! مسلمانوں کے کاموں میں، اس نے عرض کیا کہ قیمت وصول کون کرے گا؟ فرمایا میں خود اس کا بہت اچھا، چنانچہ شیخ نے ایک ایک کر کے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے، اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے، ابن السبکی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا، ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امرا کا دور حکومت آیا، وہ شیخ کے قدردان اور نیاز مند رہے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیکر شیخ کا بڑا ادب شناس اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوط بغداد اور سلطنت عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیکر نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔

مکارم اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل و قار و ہدایت کے ساتھ بڑے کریم النفس فیاض اور بخیر تھے، قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعہ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانہ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بن گئے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک بلوغ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ ہاں! مگر جنت میں میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی، انھوں نے فرمایا، جزاک اللہ۔

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور بخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔ شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابل میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانہ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کروادیا کہ جس کو ابن عبد السلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔^۱

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالا مال تھے، اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، خوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردی سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے، سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلی سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے۔^۲

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و نظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات شدید بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملك الاشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

وبعد ذلك فاننا نزعماننا من جملة	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے
حزب الله وانصار دينه وجنده	ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وكل جندى لا يخاطر بنفسه فليس	ہیں وہ لشکر ہی جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
مجنونى۔ ^۳	تیار نہ ہو، وہ لشکر ہی نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

قد امرنا الله بالجها في نصره دينه، الا
اشترى الله دينه بدمه ودينه بدمه
اق سلاح العالم علمه ولسانه كلمات
جده وهدى حكمه ديانته ودينه بدمه
سلاح الملك سيفه ولسانه، قلما لا يجوز
كاهن راس العلم ولسانه كلمات
للملوك اغماضاً لمحتهم عن الملوك
كاهن راس العلم ولسانه كلمات
والمشركين لا يجوز للعلماء اغماضاً
كاهن راس العلم ولسانه كلمات
المنهم عن الزائغين والمتبدعين
اسی طرح علماء کے لئے اہل زلیخ و ضلال اور بدعتوں

سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:-

والمخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز
دينه في اعزاز وعلية کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا
الدين، ولذلك يجوز للبطل من المسلمين
دين میں شریعہ ہے اسی لئے مسلمان ضرور کے لئے جائز
ان يغمر في صفوف المشركين وكذلك
ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف
المخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر
اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور
ونصرة قواعد الدين بالحق والبراهين
اصول دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ تقویت شریعہ ہے

مشروعة فمن خشي على نفسه سقط عنه
الوجوب ونفي الاستحباب ومن قال بان
التعزير بالنفوس لا يجوز فقد بعد عن الحق
وتأى عن الصواب وعلى الجملة فمن أثر
الله على نفسه آثره الله ومن طلب رضا
الله بما يخط الناس رضي الله عنه وارضى
عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما
يخط الله يخط الله عليه وأخط عليه
الناس وفي رضا الله كفاية عن رضا
كل أحد۔ (طبقات ج ۵ ص ۹۱)

عرب شاعر نے خوب کہا ہے :-

فليتركوا الحياء مريبة وليتركوا رضی ولا نام غضاب
(کاش کہ آپ کی محبت کی ملاوت مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہوتی، اور کاش کہ آپ مجھ سے
راضی ہو جاتے، چاہے ساری دنیا ناراض ہوتی)۔

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن و عہدہ
کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور متبحر مفتی تھے اسی طرح کہنہ مشق مصنف بھی تھے۔

ان کی تصنیفات میں "القواعد الکبریٰ" اور کتاب مجاز القرآن خاص وقعت رکھتی ہے ابن اسکی لکھتے ہیں:-

وهذان الكتابان شاهدان بامامته

و عظیم منزلتہ فی علوم الشریعۃ۔

میں ان کے علوم منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے ابن اسکی نے ان کی دو اور کتابوں "شجرۃ المعارف" اور الدلائل المتعلقة بالملائکۃ والانس علیہم السلام کی بھی خصوصی تعریف کی ہے ان کی ایک کتاب "مقاصد الصلۃ" خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں، چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالی کے بعد شیخ عزالدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے مقاصد و لطائف پر گفتگو کی اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کئے، اسی موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے تحفۃ السراپالغہ کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں حجۃ الاسلام غزالی، ابوسلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین کا نام لیا ہے۔^{۵۳}

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۶ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک نظامیہ سیرس کا عہد حکومت تھا، اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدرتھی، جنازہ میں امراء دربار ارکان سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں، سلطان نے خود کا نذہادیا، اور دفن میں شریک ہوا، شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا از و حام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے، اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلافت ہے اگر اشارہ کرتا تو میری سلطنت چلی جاتی اس کے انتقال کے بعد مجھے اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔^{۵۴}

۱۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص ۱۰۳ ۲۔ ایضاً ص ۹ ۳۔ حجۃ الاسلام علیہ مطبع صدیقی ۴۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص ۵۵ ۵۔

فتنہ نانا اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

تاناری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کر دے یہ تاناری غارتگروں کا حملہ تھا جو مور و ملح کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطان قت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاناری تاجروں کو قتل کر دیا جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے پھر جب جنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کر دیا اس پر تاناری خاقان جنگیز خاں نے برا فروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو ابدی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے اور خاص طور پر سورہ اسرا کی ابتدا میں بنی اسرائیل کی تباہی قتل عام و نکبت و ذلت اور بیت المقدس کی تخریب بے حرمی کی جو داستان عبرت سنانی گئی ہے اس کی روشنی میں اس فتنہ عالم آتش

لہ اس موقع پر سورہ اسرا کی آیات وَ قَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ فِي اللَّيْلِ أَنْ يَبَاسُ فِيمَا قَسَدْتَ فِي الْأَرْضِ مَرْثِيًّا وَلَ تَعْلَمُنَّ عَلٰٓى الْكِبَرِ

سے لے کر وَ لَبِثُوا فِيهَا ثَلَاثِينَ سَنًا تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیاۓ اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہونا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلابِ عالم اسلام پر امنڈ پڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلام کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ منحوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھ اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پیچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک جمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع وزیر خیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہو گئی، دنیا کے بہت سے بانیانِ سلطنت اور الوالعزم فرمانرواؤں کی طرح اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افرادِ خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، اس طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ قراں ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار ان اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی، جن کو سلطان صلاح الدین نے پُریمی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

لے ہندوستان میں عالمگیرِ عظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا اور مصر بھیہ زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۷ء میں جبکہ چچیتے
 الملک لعاذل اور الملک لافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی
 اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی، اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازار
 تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابوشامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک لعاذل (سلطان مصر) نے
 صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت
 آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمویت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو
 کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مورخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے
 لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا، سنت الشہ کے مطابق آسمانی
 تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے، جو توبہ، انابت اور اصلاح حال
 کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۷ء میں ایک عظیم زلزلہ آیا جس کی زد میں خاص
 طور پر ملک شام، بلاد روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے
 ہو سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرأۃ الزمان"
 کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مبالغہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔
 ادھر غیر معمولی حوادث پیش آ رہے تھے، جو مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے
 بالکل کافی تھے، ادھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا،
 ۶۰۱ء میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ
 ہوئی، ۶۰۲ء میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے مسلمان کا
 خون بہایا، ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر (۶۰۳ء) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

۶۱۶ھ میں جزیرہ کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی، اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر
دمیاط پر قبضہ کر لیا، جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مرکز خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری نشان و شوکت بھی تکلفات اور دولت و
تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے نقطہ عرف کو پہنچ گئے تھے، خلفاء کے منظور نظر مصاحبین اور معتدین کی دولت
(جو غلام کی حیثیت سے حرم خلافت میں داخل ہونے لگے، اور فراش، ساقی، ہنتم، تو شک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز
تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زر خرید علما الدین الطبری الظاہر
کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نئی جائیداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی
نظیر نہ تھی، یہی حال مجاہد الدین ایک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں
کی شادی میں جو بھیر دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، آخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ
لاکھ دینار سالانہ تھی، یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فراش کا تھا، جو یور علم سے عاری، لیکن شاہانہ معیار کی
زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی
تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے، ان میں سے بڑے بڑے استاد کو ۱۲ دینار ماہوار سے
زیادہ نہیں ملتے تھے، جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشراہی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک
امیر کی شادی میں لٹائے، اور تین ہزار دینار شراہی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں
موصول سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے، سارا شہر

۱۱ جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو خطہ افرات کے درمیان واقع ہے، اس کو بلاد امین النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ "جزیرہ"

کے نام سے مشہور ہے، اور جنوبی مشرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۱ البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۹

۱۲ یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں "الکواکب النجۃ" اور "العسد السبوح" سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے ان کا تماشہ دیکھنے میں محاور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے اسواج طرح بے تکلف دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضا ہوتی تھیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۳۳ھ کے عید کے موقع پر چوٹا ہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضا کر کے پڑھی، اسی طرح ۶۳۴ھ کی عید الاضحیٰ کو اہل بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے اور نماز عید انھوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا، اور اس میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، جامدادوں کی ضبطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے، اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پران کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۳۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ اس سن ہجری کی ابتدا اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برسہا برس رہیں، دار الخلافہ بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۳۴ھ سے ۶۳۳ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم و مسلسل مہول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا، ۲۱ دن تک بیت الشریعت کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بدشگونی لی۔

۵۷۵ھ میں اناصر الدین الشہ تحت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیا بیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافت عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

مذمت کی ہے مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

”رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ایران ہو گیا ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہو گئے، اس نے اُن کی جائدادیں اور دولتیں ضبط کر لیں، اس کے کاموں میں بڑا انصاف تھا، آج ایک بات کرنا تھا، کل اس کے خلاف اس کو تمام ترکہ پسی تفریحی مشاغل سے بھی اس نے جو انہری و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون پر گری کا عراق سے خاتمہ ہو گیا، خلیفہ کی شیعہ کی ان تفریحات سے حد کو پہنچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب سے پہلے تاتاریوں کو اسلامی قلم و پر حملہ کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے پاس پیام بھیجا۔“

۶۲۲ھ میں الناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی، اور مستنصر باللہ (۶۲۳-۶۲۴ھ) اس کا جانشین ہوا، یہ خلیفہ دیندار، پاکیزہ سیرت، پاکیزہ خصال اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۳۴ھ میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار و محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی مسکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دو شعبہ اور جمعرات اور ماہ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مورخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر حرص اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۴۲ھ میں ابن العلقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعہ فال نکلا، خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا

لے غوازی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے، ۵۲ تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۱۸۱۔

۵۳ ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۵۹۔ پورا نام مؤید الدین ابو طالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے، ان واقعات کے دل میں بدلی کا پیدا ہونا اور جذبہ انتقام کا ابھرنے کا قیاس نہیں اس وقت اگرچہ تاریخی خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاریخی فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعرا نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ فساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمران خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعار اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلہ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہنچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ اشرکے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور مکیو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزر جی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”جاگیروں اور جائیدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رفاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں شغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، اعمال سلطنت نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمائے کی فکر ہے۔“
آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:-

”یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تورہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی۔“

ادھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شریک غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیا کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا و حوصلہ مند عالی ہمت اور کوشور کشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶-۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ ایمب (H. LAMB) اپنی کتاب ”چنگیز خاں“ میں صحیح لکھتا ہے:-

”اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر خدا نے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلی گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا جنہوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین ملوک سے قطع نظر کر کے ہر روز انہوں نے ترقی پر تھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں، ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصر الدین الشہاس سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو مانتے تھے، خلیفہ

بعد ادنیٰ و اقلیٰ اقتدار سے محروم ہو کر پائے روم کی طرح صرف دین کا بادی و رہنما رہ گیا تھا۔

عرب مورخین علامہ الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر شخصی عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلاحیت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں، جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی پسپائی کا بہترین عنصر اس غیر ختم سلسلہ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زر خیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبہات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی ہوئی رہتی تھی، مفتوحہ ممالک کی دولت شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی ترانس و تراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا، اور فراغت و امارت اور فتوحات کے سائے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے، جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے تو اہل دل صوفیاء و مشائخ و مصلحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواظپ میں، جن کا بڑا حصہ تاریخی سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ ہیرلڈ ایمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ:-

”مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو نغمہ و سرود سے بھی شغل رکھتی تھی، اور

کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک ہیجان کی حالت ہمہ وقت ضرور رہتی تھی،

بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

اور مکی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹنے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی اور ایمان کا مالک خدا تھا^۱۔

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی، اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبہ دینی سے قطع نظر کر کے سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتداء اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں کی قیادت میں عذاب الہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذرا ہے، اور بالآخر انھوں نے ۶۵۲ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، وَاللّٰهُ وَفِیْہِ لَا تُصِیْبُہِ الدِّیْنُ ظَلَمُوا مِلَّتُمْ حَاسَةً وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔

عالم اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال لے چنگیز خاں ۶۵۳ھ ہیرالدیمب ماخوزاز ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم ۶۵۲ھ چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتداء ۶۵۵ھ سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ۶۵۶ھ میں ہوا، اس کا انتقال ۶۶۴ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی

تکمیل کی ۶۵۶ھ میں جب اتحاد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں، خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں لکھتا ہے:-

"لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک نخت ختم ہو گئے، اور یہ اس طرح پیش آیا کہ قراقرم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آ رہا تھا کہ راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا نام انیل جن تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، انیل جن کا یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔

حاکم اترار کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقرم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کر دیے گئے، اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کر دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں جلوا دیں، اس سفارت میں سے جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوئی کا خان حال سننے پر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایچی کو مار ڈالنا ایسا فعل تھا، جسے بغیر سزا کے چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے۔"

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کو ایک تودہ خاک بنا دیا، شہر کی آبادی میں کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ انا دیا یہی حشر عالم اسلام کے نامی گرامی شہروں بے ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب سے طاقتور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے، یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی میں ضم کر لیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہمت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں مسلمان موجود تھے کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کر دیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہا پڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔

تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دنیا، اسلام کی چولیس ہل گئیں، مسلمان مہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہر اس اور یاس کا عالم طاری تھا،

تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل تیار سمجھی جاتی تھی

یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "إِذَا قِيلَ لِلْعَرَبِ التَّوَلَّوْا هَؤُلَاءِ تَصَدَّقُوا" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا، جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رخ ہو جاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی خیر نہیں تھی، تاتاریوں کا رخ کرنا بربادی، قتل عام، ذلت و بے آبروی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنہ جہاں سوز کی لپٹ میں آگیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدار ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر حبیباً مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں"

اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت

سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا

ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا، اور بھولا بسر ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے

اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثہ

عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں

سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا این دم ایسا واقعہ

دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پانگ بھی کوئی

واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یا جوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان حیلوں

نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے، او

پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا اِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ
یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا

”مرصدا العباؤ کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد علیٰ ہی ہے اور جس کا مولد ہے اور مسکن بہمان اس
تاتاری غارت گری کے نذر ہو چکے تھے لکھتا ہے :-

”تاریخ شہور سنہ سبع و عشر و ستائے لشکر محمد ذول کفایتا تار خذ لہم اللہ و دَعْوَهُمْ اَسْتَیْلَا
برآں دیار و آں فتنہ و فساد و قتل و ہدم و حرق کہ ازاں ملا عین ظاہر گشت در بیچ عصر در زمان کفر و اسلام
کس نشان نہ دادہ است و در بیچ تاریخی نیامدہ و قبل ازیں پیشتر چگونہ بود کہ از یک شہر ہے کہ مولد و نشا
ایں ضعیف است قیاس کردہ اند کہ ہمیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و
ولایت و فتنہ و فساد آں ملا عین مخاذیل بر حملگی اسلام و اسلامیان ازاں زیارت است کہ در حیز عبا
گنجد و ایں واقعہ از آں شائع تر است در جہاں کہ بشرح حاجت فتنہ اگر عیاداً بالشر غیرت و حمیت
اسلام در نہاد ملوک و سلاطین بجنبہ کہ عہدہ رعایت مسلمانی و مسلمانان در روزہ ایشان است کہ
الامیر سراج علی سر عیتہم و ہُوَ مَسْنُونٌ عَنْہُمْ و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشان
نگیرد تا اتفاق جمعیت کنند و مکر انقیاد فرمان اِنْفِرُوا بِحَقِّ قَاتِلِکُمْ وَ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِکُمْ
وَاَنْفُسِکُمْ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفعہ این فتنہ نہ کنند بوی آن یقید
کہ یک بارگی مسلمانی برانداختہ شود و اکثر بلاد اسلام بر افتاد این بقیت را نیز براندازند جہاں کفر گیر و معتقد
بِاللّٰہِ خوف و خطر آں است کہ مسلمانی آن قدر اسے کہ ماندہ بود دشوئی معاملہ مادیان بے معنی چنان بر خیزد
کہ نہ اسم ماند نہ رسم

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ بر اندام تھی جہاں

ان کے پیونچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، گبن اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط روم" میں لکھتا ہے:-

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"

کیمبرج کی تاریخ عہد وسطیٰ کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید قصاد کو جس کا محرک جنگیز خاں ہوا بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ مغلوں کو روک سکیں، دشت و صحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے، پہاڑ سمندر موسمی سختیاں، قحط و بائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا، کسی قسم کے خطروں کا انھیں خوف نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں میدانِ تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا جس نے بہت سی ملکی اور سیاسی قضیوں کا چشمِ زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انھیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کے وہ حل نہ ہوتے، اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخِ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، جنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قوبلای خان پر ختم ہو گیا جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور وسیع اسطنت نے تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع کر دیے، ایسی طاقت کبھی دُنیا کے پردہ پر نظر نہیں ہوئی۔"

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالمِ اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۶۵۶ھ میں جنگیز خاں

کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیاۓ اسلام کے دار الخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور
 متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے
 قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے کچھ اندازہ ان مورخین کے بیانات سے ہوگا جنہوں نے
 اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں:
 ”بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ کل شہر جو دنیا کا پررونق
 ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ قحطی سے آدمی دکھائی دیتے تھے بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے
 ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آنے لگے ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں
 بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہو گئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہنچا اس ہوا اور وبا سے
 بکثرت مخلوق مری گرائی و یا اور خواتینوں کا دور دورہ تھا۔
 شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:-

”ہلاکو خاں نے خلیفہ بغداد (مستعصم) کو ایک خیمہ میں اتارا اور وزیر ابن العلقمی نے علما و اعیان شہر کو
 دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلح نامہ پر گواہ بنیں وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑادی گئی، اسی طرح ایک
 ایک گروہ کے بعد و گروہ بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑادی جاتی پھر خلیفہ کے معتمدین و مقربین کو بلایا گیا
 اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا، خلیفہ کے متعلق عام طور پر شہر ٹھکانا اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی
 آفت آئے گی“ ہلاکو کو ترود تھا نصیر الدین طوسی نے کہا کہ یہ کچھ مشکل ہے نہیں خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے بلکہ

لے البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵

بغداد میں ایک مہینے سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا، جو چھپا رہا، کہا جاتا ہے کہ ہلاکونے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۱۱ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پیئیں اور سور کا گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈلی گئی، اور اذان کی ممانعت کر دی گئی، یہ وہ بغداد ہے جو (جب سے آباد ہوا) کبھی دار الکفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔

بغداد ہزار خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر علوم و فنون کا مرکز، ہزار ہا علماء و صلیحان، مسکن اور دارا خلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام حساس مسلمانوں کو تڑپا دیا، اور ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے، اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

(باقی ص ۳۱ کا) کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کرنے، خلیفہ بغداد متعصم باللہ کے پاس ہلاکو نے اطاعت کا حکم بھیج دیا مرسالت ہوئی رہی، مگر کوئی فتویٰ نہیں نکلا، اب ہلاکو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، غل غل نجوم سعد و نحس کے بہت معتقد تھے، حرام الدین نامی ایک سیخ بھی اس کے دربار میں تھا، اس نے کہا کہ حلا بغداد کی گھڑی نحس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے تو اسے منہ کی کھانی پڑی ہے، اور کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حلا کرتے ہیں تو بارش بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا اور سب بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکو قان) ہلاک ہو جائے گا، یہ سن کر ہلاکو متزدد ہو گیا، ہلاکو نے طوسی کی رائے معلوم کی کہ اگر بغداد حلا کنیم عاقبت چہ خواہد شد؟ طوسی نے جواب میں کہا چیز سے خود شد جزا سیکہ بجائے خلیفہ خان خواہد بود، ہلاکو نے طوسی اور حرام الدین دونوں کو ہلاک کرنا ظہر کرایا، طوسی نے کہا کہ ہزاروں صحابہ شہید کر دیے گئے، مگر کوئی فساد ظاہر نہیں ہوا، اگر جاسیوں کی خصوصیت کہتے ہو تو ظاہر کو دیکھو جسے اماموں کے حکم سے خلیفہ وقت امین سے جنگ کی، اور اس نے قتل کر دیا، متوکل کو اس کے لڑکوں اور غلاموں نے اتفاق کر کے مار ڈالا، متعصم اور معتضد کو امراء اور غلاموں نے ختم کر دیا، مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔ ۶۵۵ھ لاکھ آبادی میں یہ کچھ بعید نہیں، بعض مورخین نے مقتولین کی تعداد اس سے کم بیان کی ہے۔

تھے، ایک دل دوز مرثیہ کہا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی زنجانی ہے، اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

آسماں رات حق بود گر خون بیار د بر زمین	برزوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک	سر بر آوردین قیامت در میان خلق ہیں
نازنینان حرم را خون خلع نازنین	ز استان بگذشت دمار خون دل آراستین
زینہار از دور گیتی و انقلاب روزگار	در خیال کس نگشتی کا پنچناں گرد و چنپس
دیدہ بردار لے کہ دیدی شوکت بیت الحرام	قبصراں روم سر بر خاک خاقاں بر زمین
خون فرزندان عم مصطفیٰ شد رنجستہ	ہم بر آں خاک کے کہ سلطاناں نہادند جسے حسین
دجلہ تو نابلست زیں پس گر ہند سر پر نشست	خاک نخلستان بطحا رکتہ با خون عجیب
رفے در یاد رہم آمد زیں حدیث ہولناک	می توان دانست بر روش زبرج افتادہ چلیں
نوحہ لائق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست	کمتریں دولت مرا ایشاں را بہشت برترین
لیکن از رفے مسلمانان و راہ مرحمت	مہربان را دل بسوزد در فراق نازنین

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے، اور جمادی الاول ۷۵۵ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے، اور شہر میں قاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں، اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے:-

”عیسائی باب تو ما سے داخل ہوئے وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کئے ہوئے تھے اور اپنا مخصوص نعرہ

لگا رہے تھے وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے جس سجد کے پاس سے گزرتے اس کے پاس شراب چھڑکتے، کچھ شراب کی بوتلیں تھیں جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گزرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکے مارنے لگے، سر تک پہنچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریف میں تقریر کی اور دین اسلام اور اہل اسلام کی مذمت کی:

ابن کثیر ذیل المرأة کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:-

”عیسائی جامع مسجد میں شراب لئے ہوئے داخل ہوئے ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ رہنا ہوا تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرا دیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان قاضی، شاہد اور علماء جمع ہو کر قلموں لگے، اور تاتاری حاکم قلعہ ایل سیان سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذات سے نکال دیے گئے، اور عیسائیوں کے سر پر آوردہ لوگوں کی بات سنی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا، جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المنظر سیف الدین قطر کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۵ھ کو عین جاوٹ کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بُری طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں:-

”تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی، اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو کپڑا لیتے تھے اور لوٹتے تھے“

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر بیریس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ ”تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں!“

تاتاریوں میں اشاعت اسلام

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلاب بلا میں بہ جائے اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور درد مند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعت اسلام شروع ہو گئی اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور سلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابل تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے نافع کا اسلام سے فتوح ہو جانا ہے تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزور شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہیں اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا قما ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ گوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاریخی سخت ذلت اور تحارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوت اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”لیکن اسلام اپنی گذشتہ نشان و شوکت کے خاکسترے پھراٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سب تکلیفیں پیش آئیں کیونکہ دو مذاہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں وہ حالت بھی عجیب و غریب اور نہایت کشمکش و توجہ ہو گئی جس وقت بد مذہب اور عیسائی مذاہب اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنہوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے مقصدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔“

”اسلام کے لئے ایسے وقت میں بد مذہب اور عیسائی مذاہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں کی کراپا سیر و بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مغلوں کے طوفانِ ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ شہر و معروف شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیر یا تو قتل کئے گئے یا ان کو غلام بنایا گیا، خانانِ مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق

۱۔ دعوت اسلام (مترجم مولوی عنایت اللہ) ص ۲۴۱، ۲۴۲ ۲۔ مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید واڑھی کا ایک بڑھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزاد

ذبح کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو قبولی خان نے اپنے زمانہ میں از سر نو جاری کیا، اور اس کی پیروی
کے لئے مخبر اور خبروں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت
آزار پہنچا، فلسوئے اس موقع پر دولت جمع کر لی اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبح کا
الزام لگایا، کیونکہ خاقان کے عہد میں (۱۲۳۶ء - ۱۲۴۶ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے
پر کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت ازیتیں پہنچائیں، اور غو خان نے بھی جو چوتھا لیخان (۱۲۸۳ء - ۱۲۹۱ء) ہوا مسلمانوں
پر ظلم کئے، اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر سامریاں کی جائیں وہ خالی کر لیں، اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا۔^{۵۳}
باوجود ان مشکلات کے غلوں اور وحشی قوموں نے جو غلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول
کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روند اٹھا۔^{۵۴}

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات
اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم
سُراغ ملتا ہے جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا
نام دنیا کو معلوم ہے مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ
پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی
تواست میں دے دیا، جو خدا کے واحد کی پرستار اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں
شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری
قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی،

لے ہو ورتھج ۱۲۷۱ء (جس وقت دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا، اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا

تو حکم منسوخ کر دیا گیا) ۱۲۷۱ء ہو ورتھج ۱۶۵۳ء دی گوین ج ۲۶۵۳ ۵۴ دعوت اسلام ص ۲۴۶، ۲۴۵

پروفیسر آرنلڈ نے "دعوت اسلام" میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جو جی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیراد اور اپر حکمران تھے، اشاعت اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

"منلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برک خاں تھا، جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۴ء تک سیراد اور کا خان رہا، اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برک خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے تعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیراد اور کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لایا، اس کا حال برک خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول ... کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برک خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برک خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیرس سے مصالحت کر لی، اس مصالحت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیراد اور کے دو منلوں کی نہایت خاطر مدارات کی، ان منلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیراد اور اور ہلاکو خاں فاتح بغداد میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو منغل جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے، بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے، جہاں دربار مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی، سلطان رکن الدین نے ان منلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند رفیق لے کر، اور برک خاں کو ایک خطا ان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیراد اور سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برک خاں کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موزن مقرر ہے، اور بچوں کو مکتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے، سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

۱۲۶۴ء میں غم الدین مختار الزاہدی نے برک خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو پرہان ثابت کیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے

مذہبی مناظروں کا حال لکھا ۱۲۶۴ء ابو الغازی قوم ۱۲۶۴ء مقرر یومی ۱۲۶۴ء ایضا ۲۱۵

رواد ہوئے تھے تو راستہ میں برکھاں کے سیرے^۱ جو سلطان مصر کی خدمت میں اطلاع کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ
برکھاں اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی ہے، غرض جب سلطان رکن الدین اور برکھاں میں رسم اتحاد پیدا ہوئی
تو سیرا دارا کے بہت مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی^۲۔

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت الیمانیہ میں اشاعت اسلام کے
متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:-

”ایران میں جہاں ہلاکو خاں دولت الیمانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکو خاں
کا بیٹا کودا جو اپنے بھائی باقا خاں کا جانشین ہوا، دولت الیمانیہ کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کیا،
ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ کودا کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو
اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن کودا جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر و صحبت
جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا،
اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام
اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے
سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلہ سے بھیجی۔

”خدا کی قوت اور قآن کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تہیید کے واضح ہو کہ
خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغاز نوجوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا
اقرار کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت
خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے اس کے دل کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے

۱۔ قریزی ۱۸۵۵ء ۵۳ ایضاً ۲۲۲ ۵۳ و صاف نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے کودا اور سلطان ہونے کے بعد احمد

لکھا ہے۔ ۵۵ بیسٹوم (دراویس تو م ۲ ص ۶۷)

کھول دیتا ہے، ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہبِ اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح
 کرنے پر مائل رہے یہاں تک کہ والدِ بزرگوار اور برادرِ بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی اور خدائے اپنی
 مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قریبائی (کورتائی) مبارک میں
 جس سے وہ مجلس مراد ہے جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے
 کے لئے بیٹھے ہیں، سب نے ل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادرِ بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جائے، اور ہماری فوجوں
 میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور مصیبت سب کے دل کانپتے اور
 تھرتھراتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں رواں کیا جائے، اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے
 بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگِ خارا کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا جس پر ان کے ارادے
 پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاصہ تھا جس کے جاری
 کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعائرِ اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے
 جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا
 چلے، اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاویں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور
 خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدائے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم شتمِ متعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو
 فرو کریں، اور جن لوگوں نے یہ رائے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں جس سے دنیا کی بیماریاں اور مکیلیغوں کے
 دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے باز رہنے کی خدائے ہم کو ہدایت
 کی ہے، اس لئے ہم پیکاروں کو جنش میں لانے، اور کمائوں پر چلے چڑھنے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور
 جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اس امر کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوة العارفین
 کی نصیحت سے جو امور مذہبی ہیں، ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں، ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و مسعودی کی
 خواہش پر مبنی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا، جو ماننے والوں کے لئے خدا کی رحمت اور زمانے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فرمان کے ماننے والوں کے لئے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی اور اتابک بہاء الدین کو جو اس سلطنت کے علمائے دواہ کیا ہے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقہ سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو بات ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں، اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کر سکیں، تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے فتاویٰ کو بلند کیا ہے، اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدی کے قوانین کو لحاظ ان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے، اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اذنان کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور درسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خاتون اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے، اور اوقات کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقت کرنے والوں کے شرائط کے موافق تقطعاتوں تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو مہتمم باشندہ سمجھیں، اور ان کے لئے سامان سفر مہیا کریں، اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں کو بآرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقہ سے جس طرح چاہیں، سفر کریں، اور فوج اور قراغول اور شیخوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، نقتے اور فساد فروہوں نیز تلواریں میان میں رہیں اور تمام باشندے آرام و آسائش سے بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و غواری کے طوق سے نکل جائیں۔^{۵۱}

”تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صدماتِ ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مثل اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی اور تعجب ہوا ہوگا کہ ایک مثل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے۔^{۵۲}

”۱۲۸۴ء میں تھکودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی جس کا سرعینہ ارغون خاں تھا، تھکودار کو اس نے قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء-۱۲۹۱ء) جو چند سال تک جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ بے طرف کر دیئے گئے،^{۵۳} ۱۲۹۵ء تک تھکودار کے جانشین اپنے قدیم مذہب شامان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان الیگانیہ کا سب سے زیادہ باعرب اور پُرسطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولتِ مغلیہ کو عروج ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے، سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا،^{۵۴} غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا تہنہا پندہا^{۵۵}

۱۔ دماق ص ۲۳۱، ۲۳۲ ۲۔ دعوتِ اسلام ص ۲۵۱، ۲۵۲ ۳۔ دے گبن ج ۳ ص ۲۶۳، ۲۶۴ ۴۔ دہہوسن قوم ص ۱۴۵

۵۔ ایضاً ص ۳۶۵ ۶۔ دعوتِ اسلام ص ۲۵۳

مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا نیک دل مسلمان ترکاں نیز توڑوں کے سر ہے جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

”اس سال چنگیز خاں کا پوتا قازان بن اورغون بن ایغایں تولی بن چنگیز خاں تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توڑوں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرت باسلام ہوا، اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سر پر بچھا ور کئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا، اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے گئے، اور ان پر جزیہ مقرر کیا، بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسلیحیں اور ہتھیار (۹) دیکھے اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔“

”آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۰ھ میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدا بندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی، اور بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی اور نکوس کے نام سے اس نے اصطبارغ پایا تھا، لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکوس خاں یعنی سلطان خدا بندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا، غرض اس زمانہ سے قلمرو ایغانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا۔“

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسط پر قابض تھی اور جس کا یانی چغتائی بن چنگیز خاں تھا، اشاعت اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

”بلاد متوسط میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات

لے آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۲ البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۴۴

۵۳ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۵۴۴ دعوت اسلام ص ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو تور اسلام کی برکت ملی وہ براق خاں تھا جو چغتائی خاں کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد سلطان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۱ء) اپنا نام رکھا، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خاں کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے انہوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودہویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ طر مشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۳ء تک سلطنت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائی مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک فوج انہوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طر مشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیے، اور جب تک کا شغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضروت سے خود مختار ہو گئی تھی اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کا شغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۳۴ء تا ۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کا شغر میں آئے، اور انہوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گزر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکلیں کسوا کر اپنے رائے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ، دین بڑی سے تمہارا کیا مطالبہ؟ میں کہ شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے خوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پھرتھا اب موم کی طرح نرم ہو گیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت نکتہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا چھوڑنا، سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلم و چمٹا کر یہ کی شکل ایک سلطنت قائم کرے اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک ن بڑا بادشاہ ہو گا، تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا چند سال کے بعد تغلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا تو ایک ن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضور نہ ہوئی، آخر کار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصبح تغلق کے خیمہ کے قریب ذرا کہنی شروع کی تغلق کی جب غینہ خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا، جو چغتائی ابن جگیز خان کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔

بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکار کرتے

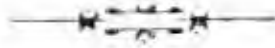
کی طرف اشارہ کر کے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتاب تعلق تیمور کے دل میں یہ بات چھب گئی اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تعلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں، اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، بہر حال اتنا محقق ہے کہ تعلق تیمور کے اسلام لانے اور بالاسط کا شجر اور سلطنت چغتائی میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، حتیٰ کہ دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و دردنے وہ کام کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں **حِزَّاهُ اللّٰهُ عَنِ الْاِسْلَامِ وَبِیْہِ خَیْرُ الْخِزَّاءِ**۔

جنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا یانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں و قوبلانی خاں جیسے نامور فرمانروا گزرے ہیں، اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرنلڈ لکھتا ہے:-

تمام سلطنت منلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر سلمان کر لیتے تھے، اوگتائی خاں (۱۲۲۹ء - ۱۲۵۱ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۳۶۹ء - ۱۳۹۸ء) خان اندانے جو قوبلانی خاں کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسو کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور تانگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے تحت میں تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، تیمور خاں نے اندان خاں کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ اندان خاں اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد اندان خاں قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ تانگوت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چکی تھی۔

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا و رویش پیدا ہوئے اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے یہاں قتلہ تاتار کے افسانے سے
پاسبان مل گئے کعبے کو ستم نانے سے



مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (۳۶۷ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنہوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا، کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شے کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متمکلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعرہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انہوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ماورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انہوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور خالق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل و نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جاسکتی تھی اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابو الحسن اشعری یا حجت الاسلام غزالی سامعہند اور ذہین و طباع پیدا نہیں ہوئے تھے، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی بولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، مکملین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے مترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ازنیاب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، و جہاں "جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری جو اس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسہ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جاسکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی، امت کی قوت عمل اور اس سے بڑھ کر حرارت عشق، جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی، اور "حرارت عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر "زندگی" اور محبت "معرفت" اور نگاہ تائب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی جو دلِ درندہ اور فکرِ ارجمندوں اور سے فیضیاب ہو جس کے لئے عقلیات کا سمندر پایاب ہو چکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو جو اپنی گرمی عشق اور سوزِ دروں سے اس سنج بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور قفل کے اس نگار خانہ میں عشق کا صور پھونک دے جو ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخافین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی شکن دور کر دے اور دل کی گرہ کھولے اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۷۶۲ھ) کی تھی جن کی ثنوی علمِ کلام کی بے اعتدالیوں اور قفل کی ہنوں پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے اور ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف ”مرآۃ الثنوی“ نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف ”صاحبِ الثنوی“ میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

لے قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں ثنوی اور صاحبِ ثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے ان کی کتاب ”مرآۃ الثنوی“ سے تعلق لڑ پھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی ”مرآۃ الثنوی“ کے علاوہ (جو طبع ہو کر قبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور مختصر تصانیف ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحبِ الثنوی (۲) نقدِ الثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت ادبیاتِ رومی میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی صاحبِ الثنوی دارالمصنفین میں زیرِ طبع ہے، راقمِ سطور کو ان کے صاحبزادہ توکل حسین کی عنایت سے اس پیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاء اللہ شہیرا۔

خاندان اور والدین

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے آپ کا نسب آپ کی جانب سے نواسطوں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔ مولانا کے آبائے کرام بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلہ میں اجلہ علماء اور سلاطین وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکہ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی حضرت بہاء الدین ولد نو عمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہی کہ انصائے خراسان سے مشکل فتاویٰ آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا ساتھ، سلطان العلماء خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و مسائل بیان فرماتے، روشنیہ اور حجبہ کو عام و غلط کہتے، ہیبت نمایاں رہتی اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۵۴۳ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۵۴۴ھ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے افکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنایا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کر سکتے ہیں اس پر ملاذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو کباب شاہی میں تھے، مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو، اور تدارک مشکل ہو جائے، یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہیے، فاضل مذکور نے

لے عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا، جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو نقول پٹی آرہی ہے، اس نے کہ حضرت بہار الدین ولد نے بلخ کو ۶۹۵ھ یا ۶۹۶ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۹۷ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے تنقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فروزانفر جن کی تحقیق کتاب زندگانی و مولانا جلال الدین محمد ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے، کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہار الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۹۵ھ کا واقعہ ہے، اور امام فخر الدین رازی ۶۹۵ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۳۱۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہار الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور

یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔
 اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ و دقینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے، جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا۔
 ابانی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا شہر میں ایک تہلکہ عظیم برپا ہو گیا، خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادہ سفر سے باز رہئے، مگر آپ نے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعالی کر آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا، مولانا نے اس کو منظور فرمایا، جمعہ کو وعظ کیا، اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر نثار آ رہا ہے۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔
 بغداد کو مظہر دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا، اور درس و تدریس میں مشغول رہے، آقشہر سے لارندہ تشریف لائے، جو تابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کی قیادت سلطان روم کی خواہش و درخواست پر آپ ۱۲۳۷ھ میں قونیہ تشریف لے گئے،

لے بدیع الزماں فروزاں فرما چکا یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاریکوں کا روم خراسان ایران تھا اس اطلاع سے ٹپے نے

خاندان شرفاء و علماء ترک ظن کر رہے تھے اور محفوظ مقامات کی طرف رخت سفر باندھ رہے تھے ملاحظہ ہو۔ ۱۵ (مندی)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا، اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسہ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہو گیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔
اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے، اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے، ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے، جو آئندہ آپ کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔
قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدر الدین گہر تاش نے آپ کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کے لئے مدرسہ خداوندگار تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاء الدین کی قباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ دفع سیل و منع خیل کے لئے اچھا ہے، مگر مظلوموں کی تیر دیا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں لاکھوں بروجوں سے گذر جاتی، اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے، سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور علماء و اکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے اور آپ نے سلسلہ درس و تدریس اوفقیین و ارشاد کو بدستور جاری رکھا، سید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہو گئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۳۷ھ میں انہوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۷ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور حلب میں وارد ہوئے،

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک مظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شذاکی تحریک سے جو اجلہ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن الحدیم سے استفادہ کیا مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول پیر سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، پیر سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ ابو حد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قنوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۵ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید برہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء مظاہر کے لباس میں رہے اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزم علم آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آگئے جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا المجاہد وای بناتے اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشنال تھے جو علماء مظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت مشغل تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا مشغل یا فرض وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا مشغل بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے، اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلابِ حال

یہ حالت ۶۳۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قنوی کو مشہور روزگار مولاناؒ روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریزی سے ملاقات اور ان کی ذات سے شفیقتی و فائیت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریزی

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریزی کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامہ معلوم ہے۔

نے درو اصل و نے نسب پیدا است می نہ دانیم ہم کہ اوز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبہ عشق و محبت کے حامل تھے، مناقب العارقلین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

لے بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ امیکا نسل سے تھے، ان کے والد جلال الدین حسن جب مہذب امامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صبیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نو مسلم

کے لقب سے مشہور ہوئے، لیکن یہ روایات مشتبہہ اور قابلِ بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ۵۳، ۵۴ (نوی)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلیمان کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین بنجاسی کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردان خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، ندیہا پہنتے، اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے، اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدا یا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہنچے، اور شکر و خوشیوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوا چلے آ رہے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ہے

لے بدیع الزمان فردوز الغر نے بجائے زین الدین بنجاسی کے رکن الدین بنجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ بنجاس زنجان کے توالح میں سے ہے، ص ۵۵، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے، (ندوی)

علم کر تو ترانہ بستاند جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متغیر و متحر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، یہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں:۔
شمس تبریزی بہارِ حقیقت بنمود از فیض قدم اوست کہ ایماں داریم
ابھی تک مولانا استاد دوران تھے، اور خود صاحبِ سجادہ تھے، اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید طالب
اب مولانا مستفید طالب تھے، اور شمس تبریز صاحبِ فیض و ارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں:۔
شیخ استاذ گشت نو آموز درس خواندی بخدش ہر روز
گرچہ در علم فقہ کمال بود علم نو بود کو بوسے بہ نمود
خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں:۔

زاد بودم تر نہ گویم کردی سرفتنہ بزم دیادہ جویم کردی
سجادہ نشین باوقار سے بودم بازیچہ کو دکان کویم کردی
نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

لے صاحبِ المشنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت مذکورہ دولت شاہ کی ہے، ص ۱۹۶، ۱۹۷

فروز انفر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فریفتگی کا سبب کسی

اجا تک اتہ اور تصرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردانِ خدا کی تلاش عشق و اہل عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی
جلال الدین محمد غزالی (ہندوی)

ترک کر دی، خود فرماتے ہیں :-

عطار دوار دفتر پارہ بودم ز دشت اوزمانے می شستم
چو دیدم نوح پیشانی ساقی شدم مست و قلم ہارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہربات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے، تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، ایک برس ہی کے ساتھ گو نہ سیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف و اکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام و نسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس و عطا سب بند ہو گئے، ضروری کوئی ساحر یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنک کی طرح بہا لے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہو گئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، ادھر ادھر مل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفورِ عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزرده ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ و فساد پر ہوگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پینچٹھ کیم شوال ۶۸۳ھ دی ہے اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا اس کے برعکس واقع ہوا اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے جو کچھ توجہ تھی وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ شمس الدین کا خطا چاکلک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے اس صہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بتیابی کا ذکر کیا ہے پہلے نامہ شوق میں فرماتے ہیں ۷

ایہا النور فی الفواد تعال غایۃ الوجد والمراد تعال

ایہا السابق الذی سبقت منک مصدوقۃ الوداد تعال

چوں بیائی زہے کشاد و مراد چوں نیائی زہے کساد تعال

انت کا شمس اذنت و نأت یا قریباً علی البعاد تعال

اس اشعار میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت ترک کر دی ہے مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے

اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگزر فرمائیں اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کر دی	از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہم شب چو شمع سے سوزیم	ز آتش جفت و ز انگیں محروم
در فراق جمال تو مارا	جسم ویران و جان از دیوں بوم
ہاں عناں را بدیں طرف برتاب	زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال	بچو شیطان طرب شدہ مرحوم
یک غزل بے تو بیچ گفتم تشد	تا رسید آں مشرفہ مفہوم
پس بذوق سماع نامہ تو	غزل پنج و شش بشد منظوم
شام از تو چو صبح روشن باد	اے بتو فخر شام و ارمن و روم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آکر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دورِ خیرِ می کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزر دگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تابخانہ کے قریب ہی دالان صنف میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے

منہجے صاحبزادہ (چلی علاء الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ شفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کہ ورت تھی کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظر عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے اگر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے، اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسبیل سکایا، یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے ترشح ہوتا ہے کہ مولانا ابھی بالکل اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے، اور آپ خود ہی آزدہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعۃً غائب ہو گئے۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ تار و دزدل اندبان ہمہ

مولانا کی بتیابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد

لے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا "يَقْتُلُ اللهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ" لیکن فردا انفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس

قتل کر دیے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی ص ۵۳-۵۴) (ندوی)

کے خلوت خانہ پر جا کر آواز دی: "یہاں الدین چہ خفہ؟" برخیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جان را از فوٹ
لطف او خالی می یابیم۔

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے
مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون بے سرو پا ز عشق او چو ذوالنون
جو لوگ حضرت شمس کی آزدگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا،
لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ اپنے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ ۶۴۵ھ کا واقعہ ہے۔
حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا
کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طرہی سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے، اب یہ
حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، اندر سے میں ٹہلا کرتے تھے، اور آشکار و نہان شور و فریاد
کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ مچ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور
نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ روسیوں کی
خانہ جنگی، مصریوں کی ترک تازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم
نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص
جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا باس تک اتار کر اس کی نذر کرتے
شکرانہ دیتے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکونِ خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتشِ عشق بھڑکادی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریزی کیا چیز ہیں جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے، اور قطرہ کی تری دیا ہی سے ہے، بس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔ چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ اگرچہ مولانا قدس سرہ شمس الدین تبریزی و اعظم اللہ ذکرہ بصورتِ دردمشق نیافت یعنی در خود بیافت زیراں حال کہ شمس الدین را بود حضرتش را ہماں حاصل شد۔

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا، ۷۳۳ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دمساز قرار دیا۔^۱

شہ صلاح الدین زبید شمس دین گشت اور اندرین درزش معین
حال و قالش از وجودش می فروز ستر بایے نادر ازوے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب الدین کی اولاد تھے جو اسی گہری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے زکوٰۃ کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید بہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۷۵۳ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہر حال صاحب علم تھے، یہ صاحب توہمیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عالمی آدمی میں کبھی ورق کوٹنے رہے اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔^۲

۱۔ فردزا نفر لکھتا ہے: مولانا از دیدار شمس نومید گشت تمامی دل و گمی بہت رفت در صلاح آوردار شمس و خلیفہ و سرکرہ جود اللہ
منصوب فرمود و یاران را باطاعت سے امور ساخت، ۹۳ (زندوی) ۲۔ بدیع الزماں فردزا نفر: زندگانی مولانا جلال الدین
میں لکھتا ہے: مولانا بکوری حشم سران جود ریدہ صلاح الدین گماشت وہاں عشق و دل بانگش کی باشش داشت بائے بنیادہا
و از انجا کہ صلاح الدین مرتے و رام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام تر گردید و قریب قراری
بقرار باز آمد و برائے شکستن خمار حیران شمس از پیانہ وجود و طلب جائے سبک می نوشتند، ۱۰۳۔

دش برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے دار سرور کی طرف سفر کیا۔

چلی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلی حسام الدین ابن اخئی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ابرس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً رموی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخئی سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی، اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل ملوک مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔

۱۔ چلی ترک زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے، ۲۔ فروزانفر نے ان کی تاریخ ولادت ۶۲۲ھ لکھی ہے ۳۔ مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوئیں سب چلی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا کہ واقعہ پائنتاں کہ اگر صد ہزار کال زائد اراکات مختصراً تہ شود و ہم طاقت باشند و مارا گیتانمان باشند آن را ہم بھضرت چلی فرستیم مولانا کو ان کے بغیر انساہ و شیفگی نہیں ہوتی تھی جس مجلس میں چلی زہوتی مولانا کی طبیعت میں جوش و گری زہید ہوتی اور امر اور معرفت کی باتیں نہ کرتے جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سب

زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلی موجود ہوں تاکہ دریائے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگانی ص ۱۵۱)۔ ندوی

ثنوی کی تحریک

ثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا "ثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

لے فرور انفرنے لکھا ہے کہ ثنوی کی تالیف چلی حسام الدین کی فرمائش و طلب سے ہوئی انھوں نے لکھا ہے کہ چلی دیکھتے تھے کہ مولانا کے اجماع و مقبولین شیخ عطاء سنائی کی تصنیفات و کلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں مولانا کی غزلیات کا اگر یہ بڑا ذخیرہ ہے مگر اس میں خفائے تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع و جوش عشق ہے وہ موقع کے منظر تھے ایک رات مولانا کو تہہ دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقہ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے مولانا نے سنتے ہی اپنے عمار سے ایک کاغذ نکالا جس میں ۸ شعر لکھے ہوئے تھے پہلا شعر وہ تھا جس کو ثنوی کا آغاز اور مطلع بنا نصیب ہوا۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند و ز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔ ع

پس سخن کوتاہ باید و السلام

پس ثنوی کی تالیف کا آغاز تھا مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے لکھ لینے کے بعد حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی شغل میں گزر جاتی اور ثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی ثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی المیہ نے انتقال کیا اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا اور وہ مضمحل ہوئے ان کے اشکمال سے مولانا کی طبیعت بھی رک گئی اور دو سال تک ثنوی کا سلسلہ بند رہا پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا

سلسلہ شروع ہوا اور مولانا کی وفات تک طرزی ہا یہ مدت ۱۵ سال کی قیام (زندگانی مولانا جمال الدین محمد ص ۱۱۸-۱۱۶)۔ ثنوی

بعد حسام الدین آپ کے ہمارا دوسرا زہ ہے بلکہ سلسلہ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید بہاء الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے اگرچہ دوسری حیثیت تھے سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی "دیوان وثنوی" انہی حضرات کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے ثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہو ا کرتی ہے خود مولانا نے سلطان لد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ **يَا لَيْتَنِي لَمْ آتَخِذْ فَلَانَا خَلِيلًا** "تجانب متقی کی صفت یہ ہوگی **الْإِخْلَاقُ يَوْمَئِذٍ يَعْصُهُمْ لِيُعْصِيَ عَدُوًّا إِلَّا الْمُتَّقِينَ**" خود فرماتے ہیں:-

موجبِ ایماں نہ باشد معجزات لیک جنسیت بود جذبِ صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحبِ فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آ گئے مولانا سے طلبِ امداد کی فرمایا زمین بھوکی ہو گئی ہے، لقمہ چرب چاہتی ہے، جلد کا میاب ہو جائے گی اور یہ رحمت تم لوگوں سے

رفع ہو جائے گی اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی ہے۔

با ایں ہمہ مہر و مہر بانی دل می دہد کہ خشم رانی
دیں جلا شیشہ ہائے جان را در ہم شکنی بہ لُن تَرانی

چلیپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفا ئے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی، مولانا نے فرمایا اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیرا ہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلیپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

رو سرب نہ ببا لین تنہا مرا رہا کن ترک من خرابے شب گرد مبتلا کن
مایم و موج سودا شب تا بروز تنہا خواہی بیا بنجنا خواہی برو جفا کن
از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی بگزیں رہ سلامت ترک رہ بلا کن
مایم و آب دیدہ در کنج غم خزیدہ بر آب دیدہ ماصد جائے آسا کن
خیرہ کشی است مارا دارد و بے چو خارا بکشد کشتش نہ گوید تدبیر خوں بہا کن
بر شاہ خویر و یان واجب وفا بناشد لے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
در دیست غیر مردن کا نرا دو ابناشد پس من چگونہ گویم کان درد را دوا کن
در خواب ددش پیری در کوئے عشق دیدم بادست اشار تم کرد کہ غم سوئے ما کن
عین انتقال کے قریب فرمایا ہے۔

گر مومنی و شیریں ہم مونس مرگت در کا فری و تلخی ہم کافرست مُردن

۵ جمادی الاخریٰ ۸۷۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال فرمایا۔

فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی تو ریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پڑی تو اس نے راہبوں اور قسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے انبیاء سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہونچا، آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:-

”مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان کھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امرا کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاد افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پھیلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ورنہ زیادہ ترجمت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے۔“

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، سہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

”ابو معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔“

میں نے کبھی ان کو شبِ خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:-

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او تنہا لیں
سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو
پر سر رکھ لیٹتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف
ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ مخند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدہ من بر فلک اتارہ شمر د
خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من ز ہر فراق تو بنوشید و بمر د
روزہ اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق
ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی،
اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

چو نماز شام ہر کس نہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و لوح و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نماز در مسجد بسوزد چو درد در سداذ آنے
عجبا نماز مستان تو بگو درست ہست آن کہ انداز زمانے نہ شاندا و مکانے
عجبا دو رکعت مست این عجبا چہار آیتیں عجبا چہ سورہ خواندم، چو نہا شتم زمانے
در حق چگونہ کویم؟ کہ نہ دست ماند ز دل دل دوست چوں تو بردی بدے خدا مانے

بخدا خبر نہ دارم چو نمازی گزارم کہ تمام شدر کوئے کہ امام شذفلانے
ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نمازیں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں
سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر پھوٹ گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے،
لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلی حسام الدین کے
پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار
کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور فرماتے کہ آج ہمارے
گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے،
اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور قنایت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے
راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، ادھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو
بٹا دیا، مولانا نہایت آزرده ہوئے، اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سر راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ اوعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزانہ مقرر تھا چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گوئیں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کر دو تا کہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہل دنیا سے کیسوی

مولانا کو باطنی امرا و سلاطین سے نفرت تھی، صرف حسنِ خلق کی وجہ سے ان کی مل لیتے تھے، ورنہ ان کی صحبتوں کو کبھی دور بھاگتے تھے ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمائیے گا فرمایا: ”معذرت کی ضرورت نہیں میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں“

مثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

مثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشیں صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پرے ڈال دیئے تھے، وہ دفعۃً اٹھ گئے، اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر زہر مویم دمید از رگ اندیشہ ام آتش چکیدہ

اس مقام پر پہونچ کر عارف کے ہر بن موسیٰ سے صدا آتی ہے کہ۔

در جهان یارب ندیم من کجاست نخل سینا یم کلیم من کجاست

یہی وجہ تھی کہ ہمد و ہمراز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع

شمع راتنہا طلیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ از و باشد خیال اجتماع

قوتے گیرد خیالات ضمیر بلکہ صورت گردد از بانگ صغیر

آتش عشق از نوا ہا گرد تیز آہنچنانکہ آتش آں جو ز ریز

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول۔

بوش نطق از دل نشان دوستیت بستگی نطق از بے الفتی است

دل کہ دلبر دید کے ماند ترش بلبل گل دیدہ کے ماند خموش

اس سانسے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام ثنوی ہے یہ ان کے خیالات و حالات و واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے اس میں صاحب کلام کا سوز و درد، ہوش وستی، اور ایمان یقین بھرا ہوا ہے اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع۔
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشو و نما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس و معقولی عالم تھے، توفیق الہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی ظلم سے ترقی کر کے حقیقت و معرک تک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور جو اس ظاہری پر تھا، ان حواسِ خمسہ کو علم اور حصول یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آ سکے، اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس حیثیت کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقص پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

تھی، مولانا اس حواس پرستی اور اس کے پر جوش و کیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

چشم حس را ہست مذہب اعتزال دیدہ عقل است سنی در وصال
سخرہ حس انداہل اعتزال خویش راستی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند او معترزی است گر چہ گوید ستیم از خامی است
ہر کہ بیرون شد ز حس سنی و لیست اہل بنیش اہل عقل خویش بیست^۱

انہوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان حواس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواس باطنی عطا ہوئے

ہیں، یہ حواس باطنی حواس ظاہری کے مقابل میں کہیں زیادہ وسیع اور وسیع ہیں، فرماتے ہیں:-

پنج حصے ہست جزایں پنج حس آن چو زر سرخ و ایں حسہا چو مس
اندر ان بازار کاہل محشر اند جس مس را چوں حس زر کے خزند
حس ابدان قوت ظلمت می خورد حس جان از آفتابے می چرد^۲

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے پنہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حجت منکر ہی آمد کہ من غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
بیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است آن ز حکمت ہائے پنہاں فجرست
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیت ایچو نفع اندر دوا ہا مضمحلست^۳

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی

کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:-

چونکہ ظاہر ہاگرفتند احمقان اُس دقائق شد از نشان بس نہاں
 لاجرم محبوب گشتند از عرض کہ دقیقه فوت شد در مفترض^۱
 ہوا س سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف
 کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں اور وہ اس عالم کا کوئی
 تجربہ نہیں رکھتی دریاے شور کا رہنے والا آپ شیریں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمہ شور است جات تو چہ دانی شط و جیون و فرات^۲
 وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں ان کے
 نزدیک ادہام و شکوک اس کا ثمرہ عالم ظلمات اس کا وطن ہے وہ عقل کے لئے باعث بدنامی اور انسان
 کے لئے سبب ناکامی ہے اس عقل جزوی سے دیوانگی ابھی!

عقل جزوی آفتش وہم ست وطن زانکہ در ظلمات شد اورا وطن^۳
 عقل جزوی عقل را بد نام کرد کام دنیا مرد را بے کام کرد^۴
 زیں خرد جاہل ہی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن^۵
 وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دور اندیش کا تجربہ کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔
 آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را^۶
 پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے اور اگے لئے
 کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمہ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔
 اندرین بحث از خرد رہیں بدے فخر رازی را ز دار دین بدے^۷
 ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پر داختہ علوم علم حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:-

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید و ز خیال حکمتے بے فیض نور ذوا بجمال
حکمتے دنیا فزاید ظن و شک حکمت دینی برد فوق فلک

ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:-

پائے استدلالیان چوبیس بود پائے چوبیس سخت بے نمکیں بود

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ منکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سانس دیتا ہے خود بے روح، اور ذوق و کیفیات یقین سے محروم ہے۔

آن مقلد صد دلیل و صد بیان بر زبان آرد ندارد هیچ جان

چونکہ گویندہ ندارد جان و فر گفت اورا کے بود برگ و ثمر

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے، اس عقل ایمانی کے قائل ہیں جو خود عقل کے لئے رہنا اور اس کے لئے چراغ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت رکھتی ہے جو عقل جزوی جسم کے ساتھ اور جس کے بغیر عقل عقل کہلانے کی مستحق نہیں اس لئے اس کو عقل عقل

نہہ سکتے ہیں عقل عقل ان لوگوں کا حصہ ہے جو ذرا ایمان اور دولت یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی شہسوار عقل عقل آمد صفی

عقل جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں عقل عقل سے عالم مطلع انوار ہے۔

عقل دفتر ہاگند یکسر سیاہ عقل عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی و سپیدی فارغ است نور ماہش بر دل و جان بانغ است

عقل ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے

اندیشے ہیں عقل ایمانی کا تقاضا اطمینان و سکون اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقل ایمانی چو شحہ عادل است پاسبان و حاکم شہر دل است

عقل در تن حاکم ایمان بود کہ ز ہمیش نفس در زندان بود

ان کے نزدیک جس طرح جو اس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت

حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیر عقل باشد اسے فلاں عقل اسیر روح باشد ہم بدان

دست بستہ عقل را جان باز کرد کارہائے بستہ را ہم ساز کرد

فلسفی ادنی معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے

ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون عقل از دہلیزی تا ید برون

فلسفی خود اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بد قسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف

اور رخ صحرا کی طرف ہے اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت کو بد و کوراسوے گنج است پشت
 کو بد و چنداں کہ افروز می دود از مراد دل جدا ترمی شود
 فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر بڑا وسیع النظر صد ہا چیزوں سے آشنا مگر اپنے سے نا آشنا ہے
 حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم جان خود را می ندانداں علوم
 دانداد خاصیت ہر جو ہرے در بیان جو ہر خود چون خرے
 قیمت ہر کالہ می دانی کہ چہیت قیمت خود را ندانی ز احمقیست
 جان جملہ علمہا این ست این کہ بدانی من کیم در یوم دین
 وہ اپنے زمانہ کے عالم و متکلم کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں
 جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان حکمت ایمانی را ہم بخوان
 وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہوگی، لوح دل جتنی صاف ہوگی، حکمت
 ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے، اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام
 کے علوم و معارف وارد ہوں گے، اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن ز اوصاف خود تا بہ بینی ذات پاک و صاف خود
 بینی اندر دل علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و ادست
 دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

روزِ دل گر کشادست و صفا می رسد بے واسطہ نورِ خدا

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علمِ کلام اور عقلیت کی جو سرد ہو، عالمِ اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی، اس سے دل کی انگلیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

بکھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلمان نہیں خاک کا ڈھیر ہے
اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالمِ اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخنا شیریں شود	وز محبت مسہار زیں شود
از محبت درد با صافی شود	وز محبت درد با شافی شود
از محبت سخن گلشن می شود	بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگ روغن می شود	بے محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود	وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود	وز محبت شاہ بندہ می شود

وہ عشق کی طاقت و نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جسمِ خاک از عشقِ برافلاک شد کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا طور مست و خمر موسیٰ صغقا^۱

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی^۲

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

بادِ دو عالم عشق را بیگانگی اندر و ہفتاد دو دیوانگی^۳

وہ شاہوں کا شاہ اور مظلوموں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تحت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدائش جان سلطانانِ جاں در حشر

غیر ہفتاد و دو ملت کیش او تخت شاہانِ تختہ بندے پیش او^۴

اس فقر جو راور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرستی کی کیفیت

طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بخود ہو کر کہتے لگتے ہیں۔

ملکِ دنیا تن پرستانِ راحل ما غلامِ ملکِ عشقِ بے زوال^۵

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ

و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجِ رواں شفا جو بند و این رنجِ افزون جوید و دردِ چنین

خوبتر زین سم ندیدم شر بتے زین مرضِ خوشتر نباشد صحے^۶

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

پس مقامِ عشق جانِ صحت است رنجِ بالیشِ حسرتِ ہر راحت است^{۲۵}
 یہ عشق پاک یا ز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے بیچ ہیں اس سے ایک گھڑی
 میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے وہ سا اہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے سالہا نسبت بدین دم ساعتے^{۳۲}
 راہ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔
 خون شہیدانِ رازِ آبِ ولی تراست این خطا از صد صوابِ اولیٰ تراست^{۳۳}
 عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جاسکتے ہو۔
 گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست
برده ویران را خراج و عشرت ۵۵
عشق آدم کی میراث اورزیر کی و چالا کی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و مہم است زیر کی زابلیس و عشق از آدم است

زیر کی و چالاکی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے اور سپردگی زیر کی و چالاکی 'شاوری' (پیرا کی) کا فن ہے، 'عشق' کشتی نوح، زیر کی و چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحبِ عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟

زیر کی سیاحی آمد و بحار کم زہد غرق است او پایاں کار

عشق چوں کشتی شود بہر خواص کم بود آفت بود اغلب خلاص^{۱۵}
عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن قیاس
ہے، اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیر کی بفروش و حیرانی بجز زیر کی ظنیت، حیرانی نظر^{۱۶}
مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں لیکن عاشق
بننا ممکن ہے، اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیست، یعقوب باش ہجواد یا گریہ و آشوب باش
تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش چوں نیلیا تو مجنوں گرد فاش^{۱۷}
وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے اور ترقی ہے، وہ محبوب
بننے میں کہاں ہے؟ اگر محبوبان عالم کو اس دولت سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صف سے نکل کر عشق^{۱۸}
کی صف میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی اے گمان بردہ کہ خوب و فائق^{۱۹}
لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے،
اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہئے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار عشق را بر حے جان افزائے دار^{۲۰}
اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی
تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در لہر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر

عشق آن زنده گزین کو باقیست و شراب جانفرایت ساقیست

عشق آں بگزین کہ جلد انبیاء یافتند از عشق او کار دیکش

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ حسن ازل سدا ہے
عشق نوازاوردوست طلب ہے۔

تو لگو مارا بدان مشہ باز نیست با کریمان کار ہا دشوار نیست^{۵۲}

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے، جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے، لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے۔

عاشقی پیدا است از رازی دل نیست بیماری چوں بیماری دل

عَلَّتْ عَاشِقُ زَعَلَّتْهَا جَدِ اسْت عَشَقُ أَصْطَرَّ لَابِ اسْمَرِ اِخْدَاسْت

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مالوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مرض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض کہنہ سے شفا پاتا ہے، تو سرور و بخود کی عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طیب جملہ علتہائے ما

اے دو اے نخت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس^{۴۴} ما

عشق ایک شعلہ ہے جو نس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کا روادار نہیں، وہ بڑا موحد بڑا غیور ہے۔

عشق آں شعلہ است کوہیں زیرِ فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

یہ شوق الہی ایک بھرنا پیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اُس حسن ازلی کا قصہ ہے، جس کا نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرح عشق ارمین گویم بردوام
ز آنکه تاریخ قیامت را حد است
حد قیامت بگذرد و آن ناتمام
حد کجا آنجا که وصف این و است^{۵۲}

لیکن عیش و عشرت کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور
دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسوسوں سے غفلت اور
ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی اور دماغ کی عظمت کا سکھ دلوں پر بیٹھنا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد
ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرنا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی
طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں
کیسا سدایہا رہا کرتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں،
جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دل اے مردان
حصن محکم موضع امن و امان
گلشن خرم یکام دوستان
چشمہا و گلستان در گلستان^{۳۹}

انہوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے بہان، لیکن نخل دل سدا جوان اور باغ دل بہار
بے خزاں ہے جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجر جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں
لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کر نقل رویدیکم است گلشنے کر عقل روید خرم است
گلشنے کر تن و مدگرد تباہ گلشنے کر دل و مدد و فرحتا ہ

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لا حاصل اور سکندر کی طرح ”چشمہ جوان“ کی ناکام
تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعه نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت
ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاط و فرح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تادائما باشی جوان از تجلی چہرہ ات چوں ارغوان
طالب دل شو کہ تاداشی چو مل تاشوی شادان و خندان ہمچو گل

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو! دل وہ نہیں ہے، جو سینہ میں دھڑکتا ہے، اور خواہشاتِ نفس
اور لہو الہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے نا آشنا یقین کی دولت سے محروم، ذوق و شوق سے خالی
ہے جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں اور جس کی قسمت کبھی حکمتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سیل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان پہو مینوا از ذوق سلطان و دود
نے دران دل تاب نور آفتاب نے کشاد عرصہ نے فتح باب

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے، یا ہی ایک دل ہے، جیسے اہل
دل کا بیدار و بیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے عقلی اشتراک و جسمانی مشابہت کے
دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ کبھی پانی ہے، جو چشمہٴ عصفی میں رواں ہے، اور وہ کبھی پانی ہے، جو کسی دلدل

یا نیچر کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جاسکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جڑ ہے کہ اسے پانی کا کالینا مشکل ہے یہی فرق دل اور دل میں ہے ایک دل مادہ پرست اور بوجہ ہوس، ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے جس کی بلند کی سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرجے، اسے سوچ کچھ کہہ دو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے

تو بھی کوئی مراد دل نیز ہست دل فراز عرش اشد نہ بہست
در گل تیرہ یقین ہم آب ہست یک ازاں آبت نیاید آبست
زانکہ گر آب است مغلوب گل است پس دل خود را گم کو کین ہم دل است
آں دے کز آسمانہا برتر است آں دل ابدال یا پیغمبر است

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالہ کہ هیچ خلقش ننگرید از خلافت آن کریم آن را خرید
ہیچ قلبے پیش او مردود نیست زانکہ قصدش از خریدن نمود نیست

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزادستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہونچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام تاکہ بے پردہ ز حق آید سلام

مقام انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پسم نظام مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں

زندگی سے بیزاری اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت انکار ذات اور خود شکستی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی۔ انسانوں کے سامنے ملکوئی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے اصلاح، تجربہ و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعرو شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعرو شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا "أَحْسَنَ تَقْوِيمٍ" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ ذَوَاتِیْنَ نَحْوَاں
 کرامی گوہر است اے دوست جان
 "أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ" از عرشش فزوں

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور کَرَّمْنَا اور
 اَعْطَيْنَا کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کَرَّمْنَا شنید ایں آسمان کہ شنید ایں آدمی پُر غمان^۱
 تاج کَرَّمْنَا ست بر فرقِ سرت طوقِ اَعْطَيْنَا کِ اویزِ برت^۲

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصہ کائنات اور مجموعہ اوصافِ عالم ہے انسان کیا ہے ایک کوزہ
 میں دریا بند ہے اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابِ در کیے ذرہ نہاں ناگہاں آں ذرہ بکشاید بان^۳
 ذرہ ذرہ گردِ افلاک و زمین پیش آں خورشید چوں جست از کین^۴
 بحرِ علمے در نمی پنہاں شدہ در نہ گزرتن عالمے پنہاں شدہ^۵

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے اسی سے اس عالم کا رنگ و بو
 اور زندگی کی آبرو ہے اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندہ آں قد و خد جملہ ستان را بود بر تو حسد
 ہیچ محتاج مے گلگون نے ترک کن گلگونہ تو گلگونے^۶
 جو ہر است انسان و چرخ اور اعرض جملہ فرع و سایہ اند و تو عرض
 علم جوئی از کتب ہائے فسوس ذوق جوش تو ز حلوائے سبوس
 خدمت بر جملہ ہستی مفرض جوہرے چون عجز دارد با عرض^۷

یہی نہیں بلکہ انسان منظر صفاتِ الہی ہے وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا
 عکس نظر آتا ہے۔

آدم اصطراب اوصاف علوست وصف آدم منظر آیات اوست

ہرچہ دروے می نماید عکس اوست ہیچو عکس ماہ اندر آبجوست

خلق را چوں آب دان صا دلال و نذر و تابان صفات ذواجلال

علم شان و عدل شان و لطف شان چوں ستارہ چرخ در آب روان

اس سبکے فرماتے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر گویم قیمت آں مستغ من بسوزم، ہم بسوزد مستغ

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے علامت عقل و تدبیرات و ہوش تو چرائی خویش را از اں فروش

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے

مشری ماست اللہ اشتری از غم ہر مشتری ہین بر تر آ

مشری جو کہ جو یان تو است عالم آغاز و پایان تو است

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے آشنا ہیں ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا قول اور صورت ہی صورت ہیں جو اپنے نفس کے مالے ہوئے اور خواہشات نفس کے قلیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند مردہ تان اند و کشتہ شہوت اند

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی حقیقی انسان کیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ بھی گشت گردِ شہر	کز دام و دودِ ملولم و انسانم آرزو ست
زینِ ہمربانِ شست عناصرِ دلم گرفت	شیر خدا و رستم و ستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما	گفت آن کہ یافت می نشود آنام آرزو ست

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترک دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیماتِ نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں۔

مرغِ گفتش خواہد در خلوتِ مالیت	دین احمد را تر تہب نیک غمیت
از تر تہب نہی فرمود آن رسول	بدعتے چوں در گرفتے اے فضول
جمعہ شرط است و جماعت در نماز	امر معروف و ز منکر استراز
در میان امت مرہوم باش	سنت احمد مہل محکوم باش

ان کے زمانہ میں توکل تعطل، محض کامرادت بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط و انتظام توکل

کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلوا توکل علی اللہ" کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

گفت پیغمبر یا واز بند
باتوکل زانوے اشتر بہ بند
رمز اکا سب حبیب اللہ شنو
از توکل در کسب کاہل مشو
رو توکل کن تو با کسب لے عمو
بہد می کن کسب می کن موبو
بہد کن جدے نہاتا وار ہی
در تو از بہدش بہانی ابلی

انہوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیئے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں یہ دلائل بڑے معقول اور روزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان تفصیل سے جواب دیا ہے، بشر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

بشر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضاء و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جدوجہد مطلوب ہے اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جد میں خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے اور تعطل اور ترک عمل منشاء الہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے صحیح اکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے فرماتے ہیں:-

گفت شیر آری دلے رب العباد ترد بانے پیش پاے ماہنہاد
 پایہ پایہ رفت باید سوے بام ہست جبری بودن اینجا طمع خام
 پاے داری چوں کنی خود را تو لنگ دست داری چوں کنی پنہاں تو چنگ
 خواجہ چوں بیلے دست بندہ داد بے زبان معلوم شد اورا مراد
 چوں اشارتہاں را بر جان نہی در وفاے آں اشارت جان دہی
 پس اشارت ہاں اسرار تودہد بار بردار دزد تو کار تودہد
 سعی شکر نعمت قدرت بود جبر تو انکار آں نعمت بود
 شکر نعمت نعمت افزون کند کفر نعمت از کفایت بیرون کند
 ہاں محسپ اے جبری بے اعتبار جز بزیں آں درخت میوہ دار
 تاکہ شاخ افشاں کند ہر محظ باد بر سر خفتہ بریز و نقل و زاد
 گر تو کل می کنی دو کار کن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت ہے اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

شیر گفت آے ولیکن ہم بسیں جہد ہائے انبیاء و مرسلین
 حق تعالیٰ جہد شان را راست کرد انچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
 جہد می کن تا توانی اے کیا در طریق انبیاء و اولیاء
 چہیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ فرزند و زن

مال را گر بہر دین باشی حمل
نعم مال صالح گفت آن رسول
جہد حق است و دوا حق است و د
منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے، جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں، جن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی، وہ بر ملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نا اہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچہ اطفال بن گئی ہے، اطلاق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:-

حکم چوں بردست زندان افتاد
لا جرم ذوالنون بزندان افتاد
چوں قلم در دست غدارے بود
لا جرم منصور بردارے بود
چوں سفیہاں را بود کار و کیا
لازم آمد یقشت خون الانبیاء

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:-

حکم چوں در دست گمراہے بود
جاہ پندارید و در چاہے قتاد
احقان سرور شد ستند و ز بیم
عاقلاں سر با کشیدہ در گلیم

عقائد و علم کلام

مولانا نے عقلیات و حیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی اظہار پرستی اور فطری موکر آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات و وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو نشل ہو کر رہ گئے ہیں اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ عشوی سے دینی اصول و عقائد اور مکھلمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور قبح عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبت ربانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روش عام منطقیین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استلال اور فطرت سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکہ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لا جواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرت سلیم کو اکساتا ہے، اور اس پر اظہارِ اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

إِنِّي أَنشَأْتُ قَابَاطَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان

(ابراہیم - ۱۰) زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بیباختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے، اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے مصنوعات سے صانع اور آثار سے موثر کی طرف دفعہ رہبری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات سے خالق، اور مصنوعات سے صانع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي آفَافِهِمْ
حَتَّى يَسْمَعُوا لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۖ أَوَلَمْ يَكُنْ
بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں
اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے
ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز

(ہم السجدہ ۵۳) پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی ثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پہنان و قلم میں خط گزار
اسپ در جولان و ناپید اسوار

تیر پیدا ہیں ونا پیدا کسان جانہا پیدا و نہاں جانِ جان^۱
لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے، اگر کہیں ہوا کی سننا ہسٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہوا کا چلنے
والا بھی ہے۔

بادِ را دیدی کہ می جنید بدان بادِ جنبا نیست اینجا بادِ ران^۲
پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست ایس کہ با جنیدہ جنبا ندہ ہست^۳
اگر تمہیں مرثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں ان آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے جسم میں حرکت
زندگی روح سے ہے روح اگرچہ نظر نہیں آتی، مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو اور امی نہ بینی در نظر فہم کن آں را با ظہارِ اثر^۴
تن بجان جنبد نمی بینی تو جان یک از جنبدن تن جان بدان^۵
موثر کے لئے اس کے آثار اور صالح کے لئے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟
آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل جز کہ نور آفتابِ مستطیل^۶
پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے، بلکہ منظم، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی
ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں،
ابرو باد بھی پیل بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں، اُدھر کو چل دیں، ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا
سرتابی کریں، فوراً گوشمالی کی جائے، یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے
اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے، اور وہ حکیم و علیم بھی ہے، اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے
کسی وقت خارج نہیں۔

گر نمی بینی تو تدبیر قدر در عناصر گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماه دو گواہ خراس گرد می گردند و می دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند مرکب ہر نفس و سعدے می شوند
ابر را ہم تازیا نہ آتشیں می زند کہ ہاں چنین رونے چنین
برقلاں وادی بہار ایں سو بہار گوشمالش می دہد کہ گوش دار

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے، اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اس میں بھی ان کا البیلا پن اور سرور و متی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ ست قصد من از خلق احسان بودہ ست
آفریدم تاز من سوئے کنند تاز شہدم دست آلودے کنند
نے برائے آں کہ من سوئے کنم در برہنہ من قبائے برکنم
من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ طیبیان الہی اور معاین قلوب ہیں، طیبیت نبض سے دل تک پہنچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں، طیبیوں نے صحت جسمانی کے بقا اور انبیاء دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے۔
ما طیبیا نیم شاگردان حق بحر قلزم دید ما را فافلق

آن طبعیان طبیعت دیگر اند کہ بدل از نبضه بنگرند
 مابدل بیواسطه خوش بنگریم کز فراست مابہ اعلیٰ منظریم
 آن طبعیان غذا بند و شمار جان حیوانی بدیشان استوار
 آن طبعیان فعالیت و مقال ملہم ما پر تو نور جلال
 کایں چنین فعلے ترافع بود وایں چنان فعلے زرہ قاطع شود
 ایں چنین قولے ترا پیش آورد وایں چنان قولے ترا پیش آورد
 آن چنان وایں چنان از نیک بد پیش تو یمیم وینا یمیم جد
 آن طبعیان را بود بولے دلیل ویں دلیل ما بود و حیٰ جلیس

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذاتی اور
 وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادائیگہ اتنی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا
 اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا
 ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ نے جمالِ جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا:۔

وَاللّٰہُ ہٰذَا لیس بوجہ کذاب بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

در دل ہر کس کہ دانش را مزہ است رود آواز پیغمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے
 امت کا ضمیر اس پر آمنا و صدقنا ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے، اس لئے کہ
 وہ صد ایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور
 دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں:۔

چوں پیمبر از برون یا نگے زند جان امت در دروں سجدہ کند
زانکہ جنس بانگ او اندر جہان از کسے تشنیدہ باشد گوش جان
آن غریب از ذوق آواز غریب از زبان حق شنود اتی قریبے

وہ کہتے ہیں کہ سنے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ان کا کہنا دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا، طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

تشنہ را چوں گوی تو تشاب در قدح آب است بتان زد آب
ہیچ گوید تشنہ کیوں دعویٰ است رد از برم اے مدعی! مہجور شو
یا بطفل شیر مادر بانگ زد کہ بیامن مادر مہاں لے ولد
طفل گوید مادر حاجت بیار تاکہ با شیرت بگیرم من قرار

ان کے نزدیک معجزہ موجب ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے ملیں گے، شاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں اور جو مغلوب و لاجواب ہوتا ہے وہ مشکل سے یارِ غار اور جانِ تثار بنتا ہے، اصل کشمکش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات بولے جنسیت کند جذب مفا

معجزات از بہر قہر دشمن است بولے جنسیت سوے دل بردن است
قہر گرد دشمن، انا دوست نے دوست کے گرد بہتہ گرو لے نے

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خوددار ہوتے ہیں ان سے استفادہ کے لئے
ادب اور نیاز مندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج ہیں ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے
سین، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اندو یک ملول از رسالت بازی ماند رسول
ایں رسولان ضمیر را ز گو مستمع خواہند اسرافیل خو
نخوتے داند و کبرے چون شہان چاکری خواہند از اہل جہان
تا ادبہا شان بجا گر نادری از رسالت شان چگونہ بر خوری

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس کا پیام لائے ہیں۔
ہر ادب شان کے ہی آید پسند کا مددیشان ز ایوان بلند

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی
کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان
کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند بعد ویرانیش آبادان کند
کرد ویران خانہ بہر گنج و زر وز ہمان گنجش کند معمور تر

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند چونکہ تن بشکست جان سر بر کند
وہ ہوا مطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت نے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں مالا عین رأت ولا اذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر

اں کے اکش کر چیں شاہے کشد سوئے تخت و بہترین جاہے کشد
نیم جان بستاند و صد جان دہد انچہ دروہمت نیاید آن دہد
ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف آنگہ بروے نوید او حروف
وقت شستن لوح را باید شناخت کہ مر آن را دفترے خواہند ساخت
چون اساس خانہ تو افگند اولین بنیاد را بر می کنند
گل بر آرد اول از قعر زمین تا با خبر بر کشی ما بر معین
کاغذے جوید کہ آن بنوشته نیست تخم کار در موضعے کہ کشته نیست
نیستی ہی نیستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، منعم

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر غمستی بتواں نمود بالداران بر فقیر آرند جود
تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو اور لوٹ پھوٹ کا
سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامہ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل
کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گل میں مقید رہتے،
اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا طائر روح قفسِ عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازان روزے کہ درہست آمدی آتشے یا خاک، یا یادے بُدی
گر بدان حالت ترا بودے بقا کہ رسیدے مرزا ایں ارتقا
از مبدل ہستی، اول نمائند ہستی دیگر بجائے اُوفشاند
ایں بقا ہا از فنا ہایاستی از فنایش روچرا بر تافتی
ایں فنا ہا چہ زیان بودت کہ تا بر بقا چسبیدہ اے بے توا

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تنہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ غم

نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است چون رہم زیں زندگی پایندگیست
عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہانِ فانی سے
چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مژدہ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری
بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہود اور ان کے ساتھیوں کے لئے قسیم بن گئی تھی۔
ہودؑ گرد مومناں خطے کشید نرم ی شد باد کا نجامی رسید

ہمچنین باد اہل با عارفان نرم و خوش ہنجو نسیم بوستان

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبر یہ کے لقب سے مشہور ہے مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر لیں گوید کہ امر و نہی راست اختیارے نیست دین جملہ خطا است

جملہ قرآن امر و نہی است و عید امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے کسی پرچھیت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اس کو چھیت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

گر ز سقف خانہ چوبے بشکند بر تو افتد سخت مجروحست کند

ہیچ خشمی آیدت بر چوب بقیف ہیچ اندر کین او باشی تو وقت

کہ چرا بر من زد و دستم شکست با چرا بر من قتاد کرد پست

واں کہ قصد عورت تو می کند صد ہزاراں خشم از تو سرزند

دریاید سیل رخت تو برد بیچ با سیل آورد گیتی خرد
گر بیاید باد و دستارت رلود کے ترا بباد، دل خستے نمود
خشم در تو شد میان اختیار تانہ گوئی جبریانہ اعتذار

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف نہیں،
اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ تصور نہیں کتے کو بھی اگر ستھپارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ
انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتر بان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتر بان سے انتقام
لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

اچنیں گر برسگے سنگے زنی بر تو آرد رود گرد و منشی
گر شتر بان اشترے رامی زند آن شتر قصد زندہ می کند
خشم اشتر نیست با آن چوپا و پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار ایں گواے عقل انسان شرم دار
روشن است ایں لیک از ظلم سحر آن خورندہ چشم بر بند ز نور
چونکہ کلی میل آن نان خورد نیست رو بہ تاریکی کند کہ روز نیست

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکماء کے نزدیک کائنات میں
علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور معلول کبھی علت، مسبب کبھی سبب سے مختلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی
اس رائے سے بڑی حد تک متاثر نہیں ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی جس شئی کا

جو خاصہ اور اثر تسلیم کر لیا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں، اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، اور علل و معلومات اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول، عام سنتہ الشریعی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں، اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرق عادت ممکن ہے، اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے، فرماتے ہیں:۔

بیشتر احوال بر سنت رود گاہ قدرت خارق سنت شود
سنت و عادت نہادہ بامزہ باز کردہ خرق عادت معجزہ
بے سبب گر عزت با موصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست^۱
عام لوگ نہی اسباب کو دیکھتے ہیں اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:۔
حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ یک معذوری ہمیں را دیدہ^۲

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے، لیکن سبب الاسباب اس سے بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ سبب الاسباب رب الاسباب اور قادر مطلق ہے، اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو کہ قادر مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

اے گرفتارِ سبب بروں میرے ایک عزلِ آنِ مسببِ ظنِ میرے
ہرچہ خواہد آنِ مسببِ آورد قدرتِ مطلقِ سببِ بردارد^۱

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسبابِ صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں بلکہ ان اسبابِ ظاہری سے اوپر کچھ اسبابِ اور ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسبابِ باطنی ان اسبابِ ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں جس طرح یہ اسبابِ ظاہریِ مسببات و نتائج کے لئے سببِ حقیقی اسبابِ ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے، سببِ اعلیٰ اور اصل سببِ ارادہ الہی اور امر الہی ہے۔

سنگِ برآہنِ زنی آتشِ جہد ہم بامرِ حقِ قدمِ بیروں نہند
سنگِ وآہنِ خود سببِ آمد و یک تو بالاترنگِ اے مردِ نیک
کایں سببِ را آن سببِ آردیش بے سببِ شد سببِ ہرگز بخویش
ایں سببِ را آن سببِ عاملِ کند باز گاہے بے پردِ عاملِ کند^۲

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں:-

واں سببِ ہا کا بنیادِ رازِ برآست آن سببِ ہا زیں سببِ ہا برآست
ایں سببِ را محرمِ آمدِ عقلِ ما واں سببِ ہا راست محرمِ انبیاء^۳

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور اُن پر غالب ہیں:-

ہست بر اسبابِ اسبابِ دگر در سببِ منگردِ راں انگنِ نظر^۴

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسبابِ ہی سے وابستہ ہے

ایں سبب پھومریض است و علیل ایں سبب پھوم چراغ است و قلیل
شب چراغ ترقیے تو تباہ پاک دان زینہا چراغ آفتاب

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسباب ظاہری میں الجھی ہوتی ہے اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے سبب اور قادر مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلہ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند معجزات خویش بر کیوان زدند
بے سبب بر بحر را بشکافتند بے زراعت چاش گندم یافتند
رنگیہا ہم آرد شد از سعی شان پشیم برابر شیم آمد کشکشان
جملہ قرآن است در قطع سبب عز درویش و ہلاک بولہبے

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنت جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے۔

لیک غلب پر سبب راند نفاذ تا یاد ند طالے جستن مراد

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تفسیر کرتے چلے جاتے ہیں جن کو شکلیں و اشاعرہ کے مناظر از طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیتان او نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنادیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

کے تنگ کوچے سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

مثنوی کا اثر

مثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیر پا اثر ڈالا اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی، جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیاۓ اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے نعموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلائل و حکایتیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں ترپاتی، اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور تر جہانِ دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین کی سر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے میرا نہیں، بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہوس نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہر حال ایک

انسان کا کلام ہے جو معصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی تاثرات کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروان فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادہ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرم سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آ سکے، اور جو اس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو ثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفہ و مادیت کے صد ہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو اتحاد و اتزناد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو ثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحب ایمان ہیں بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فی افکار (ڈاکٹر محمد اقبال)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استر شاد کا جابجا اعتراف کیا ہے اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں:-

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خمیر را از کہکشان ساز و طباب
نور قرآن در میانِ سینہ اش جامِ حم شرمنده از آئینہ اش
از نئے آن نے نواز پاک زاد باز شورے در نہاد من قنادر
دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

رومی آن عشق و محبت را دلیل تشہ کا مان را کلامش سلسیل^{۲۵}

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے قص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرح او کر دند اور اکس ندید معنی او چوں غزال از مار مید
قص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جان برد و خفتند^{۲۶}

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، مثنوی کا نہیں، مثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتی ہے اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے:-

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے^{۲۷}

یہ دولت بیدار مثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے، عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:-

پیر رومی را رفیقِ راه ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست پائے او محکم فتد در کوی دوست

— — — — —

INDEX

اَشَارِيہ

(انڈکس: "نارتھ دعوتِ عَزِیْمَت" حصہ اول)

مرب

محمد عیاض الدین ندوی

۹۹	ابراہیم بن مصعب	سیدنا ونبینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰، ۲۰، ۱۸
۹۵	ابراہیم بن ہدی	۹۴، ۷۵، ۶۴، ۵۳، ۴۲، ۳۱، ۲۰، ۱۰، ۲۹، ۱۲، ۲۱
۹۲	ابراہیم الحری	۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۹۹، ۹۷، ۸۵	ابن ابی داؤد	۲، ۶۶، ۲۶، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۲۱۶-۲۱۳، ۲۵۸، ۲۵۶، ۲۱۱، ۱۵۲	ابن اثیر	۲۸۸، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۸۱، ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۷۸، ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۷۴	ابن اسحاق	(الف)
۶۳	ابن الاشعث	سیدنا حضرت آدم علیہ السلام ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۳۳۰	ابن یطوط	سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱		
۷۴	ابن جریر کلمی	(ام المؤمنین حضرت) ام سلمہؓ ۵۵
۱۲۸، ۱۸۸، ۱۶، ۱۵۲، ۵۱، ۳۳	(عبد الرحمن) ابن ابی حزی	(حضرت) ام عاصمؓ ۳۳
۲۳۰، ۲۳۳، ۲۲۵-۲۷، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۰، ۱۸۳، ۱۴۷		(حضرت) ابن عباسؓ ۹۷
۲۵۷، ۲۵۰، ۲۳۷		(حضرت) ابویوب انصاریؓ ۲۶۱
۷۵	ابن حیوان	(حضرت) ابو موسیٰ اشعریؓ ۱۰۵
۷۱، ۶۹	ابن خلدون	ابراہیم بن ادیم ۲۳۷
۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱		
	ابن خلکان	ابراہیم بن عبد اللہ ۶۸

۲۱۶	ابن المرتجم الظالم	۲۸۷	ابن دقیق العید
۸۸	ابن المسیب	۱۱۳	ابن الراوندی
۲۴۹	ابن المقنع	۲۰۱-۳۱۹۸	ابن رجب
۲۲۵	ابن ناصر (محدث)	۱۳۵	ابن رشد
۲۲۷، ۲۲۸، ۲۰۰	ابن نجار	۳۰۲، ۴۹۹، ۲۹۷، ۲۹۵، ۲۸۸	ابن السکی
۱۱۶، ۱۰۸	ابو اسحاق اسفرائینی	۶۳، ۱۵۲	ابن سعد
۱۹۵، ۱۱۶	ابو اسحاق شیرازی	۲۰۲	ابن السمعانی
۱۸۹	ابوبکر ابن العربی	۲۸۵	ابن سینا
۱۱۲	ابوبکر اسماعیلی	۷۴	ابن شهاب زهیری
۱۸۵، ۱۸۴، ۱۱۶، ۱۰۸	ابوبکر باقلانی	۴۵	ابن عبد الحکم
۴۰۱، ۳۹، ۳۶	ابوبکر بن حزم	۱۸۹، ۱۰۵	ابن عساکر دمشقی
۸۷	ابوبکر بن عیاش	۳۱۸، ۳۰۹، ۳۰۸	ابن العلقمی (مؤید الدین ابوطالب محمد)
۱۱۲	ابوبکر بن صیرفی	۲۲۷	ابن الفارسی
۸۲	ابوبکر خلخال	۱۹۸، ۸۲	ابن قدامه
۳۳۴	ابوبکر سلمه بات	۲۷۸	ابن قره ارسلان
۷۹، ۶۵	ابوبکر فریابی	۲۸۵	ابن قیم
۲۸۱	ابوبکر محمد بن الطائی	۳۰۷، ۳۰۵، ۲۱۵، ۲۰۷، ۲۰۶، ۱۱۹، ۱۸۸	ابن کثیر
۲۷۳	ابو جعفر	۳۳۰، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۸، ۳۰۸	
۲۵۸	ابو حازم	۸۰	ابن ماجه

۱۰۰	ابوالعباس رقی	۷۵	ابوالحاکم رازی
۹۷	ابوعبد الرحمن شافعی	۱۳۱۷، ۱۱۹۰، ۱۱۱۱-۱۶۰۱، ۳-۹	(امام) ابوالحسن اشعری
۱۰۷	ابوعبد الشریح خفیف	۳۳۶، ۱۸۵، ۱۸۳	
۱۹۹	ابوعبد الشریح محمد بن یوسف البرزالی	۱۰۸	ابوالحسن باہلی
۳۸۱، ۳۷۱، ۳۵۵	ابوالعرفان ندوی	۱۸۹	ابوالحسن بصری
۲۰۱، ۱۰۵	ابوعلی جبائی	۱۰۵	ابوالحسن ابیجائی
۱۹۱	ابوعلی فارمدی	۳۱۰	ابوالحسن خزدجی
۵۶	ابوعمرو بن اعلیٰ	۲۹۹	ابوالحسن شاذلی
۳۱	ابوالفرج اصبہانی	۱۶۷، ۱۰	ابوالحسن علی ندوی
۱۹۵	ابوالقاسم ہروی	۱۱۴	ابوالحسین ہروی
۲۸۷	ابومحمد القاسم ابن عساکر	۱۵۵، ۱۵۴، ۸۲، ۸۱، ۶۸	(امام) ابوالخفیف
۲۳۰، ۷۷۹	ابومسلم خراسانی	۵۷	ابو حیان التوحیدی
۲۲۷	ابوالمنظف	۱۹۸	ابوالخیر حماد
۱۳۰، ۱۱۷، ۱۱۷، ۱۱۷، ۱۳۰	(امام الحرمین) ابوالعالی عبداللہک جوینی	۸۰	(امام) ابوداؤد سجستانی
۲۲۴، ۱۸۹، ۱۳۷		۱۹۷، ۱۹۵	ابو ذکریا تبریزی
۱۱۵، ۱۱۴	ابونصور ماتریدی	۲۴۹	ابوسعید جبائی
۲۲۴	ابوالنجیب سہروردی	۱۹۸	ابوسعید مخزومی (مبارک بن علی)
۱۳۰	ابونصر اسماعیلی	۲۰۳	ابوسلمان خطابی
۱۶۴	ابونصرتار	۱۳۴	ابوطالب مکی

۲۱	اریست ڈی بنسن (ERUSET DE BUNSEN)	۱۲۱	ابوالنصر فارابی
۷۶	اسپرنگر	۲۴۷، ۷۲، ۳۰	ابونعیم اصبہانی
۲۱	اشیفن	۱۹۷، ۱۹۵	ابوالوفا ابن العقیل
۹۵، ۹۴، ۹۲	اسحاق بن ابراہیم	۲۱۶	ابوالوفا یحییٰ بن سعید
۱۰۵	اسماعیل اشعری	۸۷، ۸۲، ۳۷	(امام) ابویوسف
۴۹	اسماعیل بن عبدالشر	۳۲۸	اتابک بہار الدین
۸۲	اشہب بن عبدالعزیز	۱۰۱	احمد بن ابراہیم دورق
۲۴	ایشوراٹوپا	۷۹	احمد بن جعفر
۱۴۲	افلاطون	۸۶-۹۳، ۸۴، ۸۲، ۸۱، ۶۲	(امام) احمد بن حنبلؒ
۳۵۵، ۳۴۵	افلاکی	۲۴۷، ۲۳۳، ۲۰۲، ۱۹۸، ۱۵۳، ۱۱۰، ۱۰۳، ۹۵-۱۰۱	
۳۹۸، ۳۶۹، ۳۶۱	(علامہ) اقبال	۱۱۴	احمد بن علی فقہ
۲۸	اکبر	۱۸۸، ۱۸۷	احمد بن نظام الملک
۱۱۶	اپ ارسلان — سلجوق	۱۳۰	احمد اراذکانی
۲۰۶	امیر الشرائی	۱۹۰	احمد الغزالی
۳۱۹	امین	۳۲	اخطل
۳۱۳	انیل جی	۱۲۵	(سیدنا) ادیس (باطنی امام)
۳۴۲	اودالدین کرمانی	۱۳۵، ۱۳۲، ۱۲۱، ۱۲۰	ارسطو
۳۲۳	اوگتائی خان	۳۲۹، ۳۲۴	ارغوخان
۳۲۴	ایل خان	۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۴	آرنلڈ

۳۹	بلاذری	۲۶۱	الویب نجم الدین
۱۱۴	بندار بن حسین	(ب)	
۲۳-۲۵	بوده	۱۲۷	باب (بانی مذهب بالی)
۱۲۱	بوعلی ابن سینا	۳۲۶	باقا خان
۸۲	بوعلی (شافعی)	۲۴۱، ۱۱۳۴	بازید بسطامی
۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۲-۶۴	(قاضی) بهار الدین ابن شداد	۲۹۸	(قاضی القضاة) بن جواهر
۳۳۲، ۲۷۷-۸۱، ۲۷۴، ۲۷۳		۱-۱۰۹۴، ۷۹، ۷۸، ۷۵	(امام) بخاری
۳۵۵	(سید) بهار الدین ترندی	۳۴۱	بدو الدین گوهر ناسخ
۲۲۴	(شیخ) بهار الدین ذکر الیامتانی	۳۳۵، ۳۳۴، ۳۳۳، ۳۳۹	بدیع الزمان فروزانفر
۳۳۹	(سید) بهار الدین رازی	۳۵۲-۵۴، ۳۴۹، ۳۳۱	براق خان
۳۴۹، ۳۴۵، ۳۴۱، ۳۳۹	(سلطان) بهار الدین ولد	۳۲۶، ۳۴۵	برک خان
۳۵۹، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۵۰		۳۵۲	(سید) برهان الدین
	(پ)	۳۴۱، ۳۳۸	برهان الدین محقق ترندی
۳۱۱، ۲۷۰	پایائے روم	۹۸	بزراری
۲۵۲	پطرس (راهب)	۳۱۴، ۵۷، ۵۶	بستانی
	(ت) (ث)	۱۶۵، ۱۶۴	بشر بن حارث
۳۲۵	تاتاری خان	۲۴۷، ۲۴۱، ۲۳۱، ۱۷۲	بشر حافی
۳۱۸	تاج الدین بکی	۱۴۲	بقراط
۲۹۸	(قاضی القضاة) تاج الدین	۱۱۴	بلال بن ابی بردہ

۲۲۱-۲۲	جمال الدین	۸۰	(امام) ترمذی
۲۸۸	جمال الدین حاجب	۱۳۱	ترکان خاتون
۱۷	جنید بغدادی	۲۳۱-۲۳	تغلق تیمورخان
۱۳۴	جنید شاہ	۲۷۷	تقی الدین
۲۴	جواہر لال نہرو	۲۲۹، ۲۲۶	نگو دارخان
۲۲۵	جوجی خاں	۲۳۷	نمذ حسین گورکھپوری
۲۲	جے بیسولنگر (J. BASSMULLINGER)	۲۶۸	نکیرو
	(ج)	۲۹۸	(الملك المنظم) توران شاہ
۲۶۵	چائیلون	۲۳۰	(اے) توڑون (نوروز بیگ)
۲۳۰-۲۲	چغتائی خاں	۲۳۷	توکل حسین
۳۱۳، ۳۵۶، ۳۵۶، ۳۵۴، ۳۵۳، ۳۱۹	چلی حسام الدین	۵۷	ثابت بن قرہ
۲۴۸	چلی علار الدین		(ج)
۲۲۲، ۲۲۲، ۲۲۲-۲۶۲، ۲۱۷، ۲۱۷، ۲۱۷، ۲۱۷، ۲۱۷، ۲۱۷	چنگیز خاں	۷۰	باخا
	(ح)	۱۲۶	جبریل
۱۹۷	(حضرت) حسن	۸۸	جبرین عبد الحمید (محدث)
۶۸، ۳۳	(حضرت) حسین	۹۵	جسربن ولید
۲۱۳	(حضرت) حوّا	۳۴۳	جلال الدین حسن
۱۳۴	حارث محاسبی	۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۵، ۱۷۷، ۳۳۵، ۳۳۵، ۳۳۵	(مولانا) جلال الدین رومی
۲۸۵	حاکم بانہر	۲۹۹، ۳۵۷، ۳۳۳، ۳۳۹	

س	جیب الزن خان شردانی	۷۶
۳۳۹، ۳۳۵	(امام) رازی	۶۳، ۵۶
۲۰۶	راشد	۱۹۹
۸۲	ربیع (شافعی)	حسن بصری ۵۷۱، ۵۳۱، ۵۵۵-۶۷۱، ۶۳۱، ۶۵۵-۷۷۱، ۷۳۱، ۷۵۵
۵۶	ربیع بن انس	۷۰
۷۴	ربیع بن صلیح	۳۴۳
۲۵	رجاء بن حیوه	۶۸
۲۶۹	رجز	۳۳
۳۳۲، ۳۲۹	رشید الدین	۲۴۹
۳۲۶، ۳۲۵	رکن الدین بیرس	۸۶
۳۴۴	رکن الدین سنجاسی	۳۲
جلال الدین	(مولانا) روم و یکھے	۳۱
۲۴	(مسر) رہس ڈائس (RHYS DAYIS)	خ
۲۶۶، ۲۶۵، ۲۵۴	ریحی نالدوانی کرک	۱۰۰
س	(حضرت) خباب	۳۳۳
۵۵	(حضرت) زید بن ثابت	۱۱۵، ۷۲
۸۲	(امام) زفر	خطیب بنداوی
۸۸	(امام) زہری	۲۶
۶۸	زید بن علی	۱۱۳، ۱۹-۱۸۹، ۸۷، ۱۳۳
		(حافظ) ذہبی

۳۸۷	سیف الدین آدمی	۳۴۴	زین الدین ستجاسی
۲۱۱۲۰	سینٹ پال	۱۸۸۱۸۳۱۱۳۷	زین الدین عراقی
۲۹۹۱۲۸۸	سیوطی	(س)	
(مش)		۳۳	سالم بن عبداللہ
۱۵۵۱۱۵۴۱۹۷۱۸۸۱۸۷۱۸۲۱۸۱	(امام) شافعی	۳۰۵	سالم حسین
۳۵۷۱۱۹۱۱۱۶۷۱۱۳۷۱۸۲۱۷۱	شلی نمائی	۵۸۱۳۵۷۱۲۵۵۱۳۷۱۳۴۵۱۲۴۲	سید سالار
۲۴۸	(شیخ) شلی	۹۵	سجادہ
۲۹۴	شرف الدین عبداللطیف	۲۴۲	سعد الدین جموی
۲۲۲	شرف الدین عینی	۳۱۹	(شیخ) سعدی
۲۳۵	(قاضی) شریح	۷۴	سعید بن ابی عروبہ مدنی
۲۴۸	(قاضی) شریک	۵۵	سعید بن جبر
۵۵	(امام) شجی	۳۳	سعید بن المسیب
۱۹۸	(امام) شعرائی	۲۴۷۱۱۵۴۱۷۱	سفیان ثوری
۳۶۱۱۳۵۵۱۳۵۴۱۳۴۳-۵۲	شمس الدین تبریزی	۱۴۲	سقراط
۳۶۱۲۶۱۲۵	شکر آچاریہ	۳۷۴	سکندر
۳-۵۱۲۸۸	شہاب الدین ابوشامہ	۲۴۸۱۵۳۰۵۰۱۳۴-۳۶	سلیمان بن عبدالملک
۲۹۹۱۲۳۴	شہاب الدین سہروردی	۷۶	(سید) سلیمان ندوی
۲۶۹	شیردل	۲۰۷۱۱۸۸۱۱۸۷۱۱۶۱۱۶۰	(سلطان) سنجر
۲۶۱	شیرکوه اسد الدین	۳۲۵	سیرادادرا

شیطان

۲۷۰، ۲۵۱، ۲۳۸، ۲۳۷، ۱۳۸

(ص) (ض)

۱۲۷، ۲۱ بیانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۳۵، ۳۴ (حضرت) عمرؓ

۳۳۸، ۲۳۸، ۱۲۶، ۸۵ (حضرت) علیؓ

۲۱۲ (ام المؤمنین حضرت) عائشہؓ

۱۶۴ (حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ

۹۱، ۹۰ عازم البولمان

۷۹ عاصم بن علی

۳۴ عاصم بن عمر

۲۸۳ عاصد لدین الشر

۳۰۴ عالمگیر اعظم

۲۲۳ (شیخ) عبد الجبار

۲۸۱ (قاضی) عبد الجبار

۹۷ عبد الرحمن بن اسحاق

۸۲ عبد الرحمن بن قاسم

۸۷ عبد الرحمن بن ہمدی

۳۲۲ (شیخ) عبد الرزاق

۸۸ عبد الرزاق بن بہام

۲۲۳ عبد العزیز

صالح اسماعیل

۲۹۳، ۲۹۱

صالح بن امام احمد

۹۳

صدر الدین

۱۸۸

صدر الدین قزوئی

۳۶۱، ۳۵۶، ۳۴۲

صدیق حسن خاں

۲۲۴، ۱۸۳

صلاح الدین الیوبی

۲۶۵، ۷۲، ۲۶۱-۶۳، ۲۵۶، ۲۵۳

۳۴۲، ۳۰۷، ۴۱۳، ۴۰۲، ۲۹۸، ۲۸۵-۸۷، ۲۸۳، ۲۸۲

صلاح الدین زکریا

۳۶۱، ۳۵۹، ۳۵۱-۵۴، ۳۴۵

صحاک بن عبد الرحمن

۴۱

(ط)

طاہر

۳۱۹

(ام) طہادی

۱۱۵

طر مشرین خان

۳۳۱

طیفور

۹۵

(ظ)

(الملك) الظاہر بایزید

۳۲۲، ۳۰۲، ۲۹۸

(الملك) الظاہر لاغر از دین الشر

۳۰۶، ۲۸۲، ۲۷۶

عبدالعزیز بن سلیمان	۲۴۸	عثمان رومی	۳۴۲
عبدالعظیم المنذری	۲۸۸	عجیف	۹۹
عبدالغافر فارسی	۱۳۴۱، ۱۳۱	عزوه بن زبیر	۳۳
عبدالقنی بن فخر فراس	۳۰۶	(شیخ الاسلام) عزالدین بن عبدالسلام	۲۸۴، ۱۲۰۱
(شیخ) عبدالقادر جیلانی	۲۰۳، ۲۰۱، ۱۹۹، ۱۹۷، ۱۹۶	۳۰۳، ۳۰۲، ۲۹۷-۹۹، ۲۹۲-۹۴، ۲۸۸	
عبدالقادر حسنی	۱۳۷	عکرم	۳۲، ۳۱
عبدالقادر جرجانی	۱۹۵	عمارالدین الطبری الظاہری	۳۰۶
عبدالشربین امام احمد	۹۳	عمارالدین کیقباد	۳۴۱، ۳۴۰
عبدالشربین زبیر	۳۴	عمارالدین محمد خوارزم شاہ	۲۳۹، ۳۱۰-۱۳۱، ۳۰۳-۳۴۰
عبدالشربین سلام	۲۸۷	علی بن حسین (زین العابدین)	۳۳، ۳۲
عبدالشربین عبدالکرم	۸۲	علی بن مدینی	۱۰۱
عبدالشربین مبارک	۱۵۶، ۷۱	علی بن یوسف ناشقین	۱۹۱-۹۳
عبدالشربین وهب	۸۲	عمادالدین زنگی	۲۶۱، ۲۵۳
عبدالله المحض	۳۳	عمادالدین الکاتب	۲۷۸
عبدالملک بن مروان	۳۲	عمر بن ابی الحسن رواسی	۱۸۹
(شیخ) عبدالوہاب	۲۲۳	(حضرت) عمر بن عبدالعزیز	۳۹، ۳۴-۳۶، ۳۱
عبدالمؤمن	۱۹۳	۲۵، ۲۴۸، ۲۴۷، ۱۹۷، ۴۳، ۴۸-۵۳، ۴۱، ۴۰	
عبد	۲۸۱	عمر کیسانی	۲۰۱
		عمر بنت عبدالرحمن	۴۰

البکر	دیکھئے	قرابا	۳۲۳۱۳۱۳۱۰	عباس بن علی
۷۹		فریری	۶۶	عوام بن حوشب
۲۶۲		فرید الوجدید	(غ)	
۱۸۸		فرید الزمان	۳۳۰	غازان
۲۶۹-۷۱		فرید رک	(امام ابو حامد محمد) الغزالی ۳۳۱۵۷-۱۳۷۱۱۲۹	
۷۱		فضل بن عیاض	۱۵۵-۵۸۱۱۵۳۱۱۵۱۱۳۵-۳۹۰۱۳۰-۳۲	
		(ق)	۱۸۳۱۱۸۳۱۱۷۷۱۱۶۸۱۱۶۷۱۱۶۱۱۶۰	
۳۲۶		قآن	۲۳۸۱۱۹۷۱۱۹۵۱۱۹۴۱۱۹۲۱۱۸۶-۹۰	
۳۰۱۳۳		قاسم بن محمد	۳۳۶۱۳۰۲۱۲۸۸	
۳۰۵		قتادہ حسینی	۳۳۱	(سلطان) غیاث الدین
۱۰۰		قتیبہ	(ف)	
۲۳۹		قرطبی	۲۸۲۱۲۸۸	(حضرت) فاطمہ
۳۲۸		قطب الدین شیرازی	۲۷۵	(قاضی) فاضل
۹۵		قواریری	۲۸۳	الغازی الدین الشہ
۱۸۸		قوام الدین	۲۹۸۱۲۹۳	محمد الدین عثمان
۳۳۳۱۳۱۷		قوبلانی خاں	۱۸۷۱۱۶۱۱۱۲۸	محمد الملک طوسی
۲۶۹-۷۱۳۵		قیصر	۳۳	فرزدق
		(ک)	۱۷۲	فرعون
۲۷۲		کاشغری	بدیع الزمان	فرودزادہ

۱۹۸۱۹۵۱۹۳۱۹۲۱۸۵۱۷۹	ماہون	۸۲	(شش لاکھ) کردی
۳۱۹			
۲۳۱	متنی	۳۳۳	کرگز
۱۱۹۱۱۰۳۱۹۳۱۹۲	متوکل باشہ	۳۵	کسری
۲۶۱	مجاہد الدین ہرروز	۳۳۲	کمال الدین ابن العدیم
۳۰۶	مجاہد الدین ایک الدویدار		(گ) (ل)
۱۶۲	مجیر الدین	۲۶	گاندھی جی
۸۲	(امام) محمد	۲۶۶، ۲۶۵	گائی
۳۲۶	(سلطان) محمد (احمد)	۳۱۷	گبن
۱۱۵، ۸۹	محمد الوزہرا	۲۶۸	گودجے
۱۲۵، ۹۹	محمد بن اسماعیل	۳۲۴	گیوگ خاقان
۱۹۷	محمد بن حسن باقلانی	۲۸۱، ۲۶۲-۶۴، ۲۵۳-۵۵	(اسٹیل) لین پول
۱۲۶	محمد بن حسن دہلی یانی		(م)
۵۵	محمد بن سیرین	۲۳۶، ۱۲۶	سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام
۳۶	محمد بن عبدالحکم	۸۶	(حضرت) قنبر بن حارثہ
۱۹۱-۹۳	محمد بن عبدالشہر توہرت	۲۸۲	(حضرت) معاویہ
۱۸۷، ۱۶۱	محمد بن ملک شاہ	۳۱۵	ماہوج
۹۴، ۹۱، ۶۲	محمد بن نصر مردزی	۲۱	مارٹن لوتھر (M. LUTHER)
۹۵	محمد بن نوح	۲۸۲، ۱۵۴، ۸۰-۸۲، ۶۸	(امام) مالک
۳۳۸	محمد بہاء الدین	۲۳۷	مالک بن دینار

۲۶۱/۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰	(سلطان) مسعود	۳۳۰	محمد خدا بنده (نگولس)
۷۷	مسودی	۶۸	محمد ذوالنفس الزکیه
۸۰	(امام) مسلم	۲۰۶/۲۰۰۵	محمد عالم کاکوردی
۷۷	(امام) معاذ بن معاذ	۱۱۵	محمد عبده
۳۱۹/۱۱-۳۱۹۵-۹۹/۹۲/۷۹	مقتضی بانشه	۱۲۷	محمد علی
۳۱۹	مقتضی	۱۳۷	محمد گازرونی
۲۳۷/۲۳۱/۷۷	معروف کرفی	۱۳۵/۱۲۲	محمد طایفی جمعه
۱۲۵	معزالدین الشرفی	۲۵۰	محمد یوسف تونکی
۷۳	معمری	۱۶۸	محمد یوسف موسی
۲۵۷	معین الدین پروانه	۲۵۵	(سلطان) محمود سلجوقی
۱۳۱/۱۱۵	مقتدی بانشه	۳۳۲	محمی الدین ابن العربی
۲۰۶	المقتضی لامر الشرف	۲۰۰	محمی الدین ابو عبد الله بغدادی
۲۸۷/۲۸۳/۲۸۱	مقدسی	۱۲۷	مرزا (غلام احمد)
۲۸۳/۲۸۲	مقریزی	۸۲	مرنی (شافعی)
۲۹۹/۲۹۱/۲۸۹	الملك الاشرف	۲۰۶	مستر شد
۳۰۵	الملك الافضل	۲۴۸/۲۰۹/۱۳۱	مستظهر بانشه
۲۵۴/۱۸۷/۱۶۱/۱۶۰/۱۳۱/۱۱۷/۱۱۵	ملك شاه سلجوقی	۳۱۹/۳۱۸/۳۰۹/۳۰۸/۲۹۸	مستعصم بانشه
۲۹۴/۲۹۳/۲۹۱	الملك الصالح نجم الدین الیوب	۳۰۸/۲۹۸/۲۸۳	مستعصم بانشه
۲۹۸			
۲۹۰/۲۸۸	الملك الکامل	۲۰۶	المستنجد بانشه

۳۱۹، ۳۱۸	نصیر الدین طوسی	۳۲۱	الملك المنظر سيف الدين قطز
۱۸۷، ۱۳۱، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	نظام الملك طوسی	۲۹۲	الملك المنصور
۱۲۶	نمروذ	۳۳۸	ملک جهان
۲۸۶، ۲۸۵، ۲۶۷، ۲۵۵-۶۱، ۲۵۴	نور الدین زنگی	۶۸	مناظر حسن گیلانی
۲۸۸	(امام) نووی	۳۱۹	مقتدر بالشیر
۵		۴۸، ۴۶، ۴۵	منصور بن غالب
۱۰۳، ۹۲	والثی	۳۱۹، ۳۱۸	منکوتقان
۲۲۹، ۲۲۶	وصاف	۲۳۳	منکوخاں
۷۷	(امام) وکیح	۲۲۳، ۲۲۲	(شیخ) موسیٰ
بیاد الدین	(سلطان) ولد دیکھے	۳۰۵، ۲۸۹	موسیٰ بن الملك العادل
۵۰، ۳۴	ولید	۱۱۴	مہبیر
۳۰۲، ۱۸۰-۶۵	(شاه) ولی الشیر	۲۲۹	موفق عبد اللطیف
۱۱۴	وینسک (WENSINCK)	ن	
۴		۱۲۶	سیدنا حضرت نوح علیہ السلام
۳۹۱	سیدنا حضرت ہود علیہ السلام	۳۱۰، ۳۰۷	تاجی معروف
۹۸، ۸۷، ۸۵، ۸۲، ۷۱، ۶۹	بارون رشید	۳۱۰، ۳۰۸، ۳۰۷	القاصر لدین الشیر
۶۸، ۳۳	یشام بن عبد الملك	۳۲۵	نجم الدین مختار ظاہری
۳۲۶، ۳۲۵، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۳	ہلاکو خان	۸۰	(امام) نسائی
۲۶۵	ہمفری	۲۶۱	نصرۃ الدین ایبراہیم

۹۰۱۸۸	یحییٰ بن عیین	۱۲۶	(موسیٰ) ہوارث
۸۲	یحییٰ بن یحییٰ لمیشی	۸۷	ایسٹم بن بشر
۵۱	یزید بن عوشب	۸۷	ایسٹم بن حبیل
۶۳	یزید بن عبد الملک	۱۳ - ۲۱۰	ہیر لد لیمب
۶۳	یزید بن المہلب		(۷)
۷۹	یزید بن ہارون	۲۲۵	سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام
۵۵	یسار	۳۱۵	یا جوج
۱۲۱	یعقوب کندی	۸۵	یحییٰ بن اکثم
		۵۰	یحییٰ بن سعید

اقوام و قبائل - طبقات و ملتیں

۸۶۱۶۸۱۶۷۳۳	اہل بیت کرام خاندان نبوت	۸۶	ارباب کلیسا
۲۸۲		۲۱	آرتھوڈوکس مسیحی
۱۱۶۱۱۵۱۱۲۱۱۱۰۱۱۰۶۱۰۵۱۰۸	اہل سنت - سنی	۳۵۳	ارموی
۳۰۸۱۲۸۳۱۲۷۴۱۲۰۲۱۱۳۶۱۱۹		۲۸۹۱۱۸۳-۸۶۱۱۱۹۱۱۵-۱۷	اشعری - اشاعہ
۱۲۶	اہل ظاہر	۳۹۶۱۳۹۸۱۳۸۳۱۳۶۲۱۳۳۵	
۳۱۰۰۱۳۶	اہل عراق	۲۸۵۱۳۶۷۱۳۵۱۳۰۸۱۷۷۱۳۸۰۲۹۱۲۰	انبیاء
۶۸	اہل مدینہ	۳۹۸۱۳۹۶۱۳۹۵۱۳۸۶۱۳۶۷۱۳۶۳	
۲۸۲۱۲۷۱	اہل مصر - مصری	۱۳۳	اہل استدلال
۲۵۰۴۱	اہل مصر - مصر	۳۰۷۱۳۰۶۱۲۴۹۱۸۷	اہل بغداد

[illegible]

۲۹۳، ۳۶۲، ۳۳۵		مسلمان ۱۱۳-۲۱۱/۱۱۹-۴۴۱/۲۰۵۲، ۴۸۰، ۵۵۵، ۵۶۰، ۶۴۰
۳۳۱، ۳۲۹، ۳۲۳-۲۶	مغل	۱۲۳/۲۱/۲۰، ۱۰۰، ۱۹۷، ۹۵/۹۰، ۱۸۴، ۷۳-۷۴
۱۹۳	ملشین	۱۹۶/۱۹۴/۱۶۵/۱۶۰/۱۵۷/۱۴۶/۱۳۰/۱۲۴
۶۳-۶۵	مناقضین	۲۶۴/۲۵۸/۲۵۵/۲۵۴/۲۵۲/۲۴۰/۲۱۹/۲۰۷/۲۰۲
۱۹۳	موصوفین	۲۱۰/۲۰۵/۲۹۵/۲۹۱/۲۸۹/۲۸۶/۲۸۴/۲۸۳/۲۶۹-۷۱
۱۱۳	هندو	۳۵۷/۳۳۴/۳۳۳/۳۲۸/۳۲۲-۲۵۰/۲۱۹/۲۱۴/۳۹۸
۲۸۱/۲۰۲/۲۰۱/۱۷۷/۱۱۳/۷۲/۲۱	یهودی	۱۸۳
۲۸۱/۲۲	یورپین	۳۵۰
۱۲-۱۸۴/۲۰	یونانی	مترجم ۱۸۶/۱۸۵/۱۷۳/۱۷۲/۱۵۷/۱۰۳-۱۱۳/۸۶/۸۵

کتابیات

احیاء علوم الدین (احیاء العلوم) ۱۵۰۰/۱۴۷/۱۴۶/۵۷	قرآن مجید
۱۸۲/۱۷۷/۱۶۲-۶۸۱/۵۹/۱۵۵-۵۷/۱۵۱-۵۳	(الف)
۲۳۸/۱۹۱/۱۹۰/۱۸۲-۸۵	ابوالغازی قوم
۳۱۸	ابن تیمیہ (البزہرا)
۱۹۳	ابن خلیل (البزہرا)
۱۱۷	پیشد
۱۱۲	امتحان السادة المتقين
۳۶۰	امتحان السادة (شرح احیاء)
اسرار خودی	۲۸۸
استحسان الخوض فی الکلام	۲۸۸/۱۹۱/۱۹۰
اخلاق جلالی	۲۶۱/۲۵۰/۲۳
اخبار و آثار	۸۹
	۱۱۵
	۳۳۱، ۳۲۵

۲۵	بہکوت گیتا	اسلام آرڈر و کرپچیانٹی	(ISLAM OR TRUE -
	(ت)	CARISTIANITY)	۲۱
۱۸۳	الراج المکمل	اشارات (ابن سینا)	۲۸۵
۲۷۸، ۱۰۲، ۱۷۹، ۱۷۲، ۳۳	تاریخ ابن خلکان	الأشعری البواکسن	۱۱۴، ۱۱۳
۳۲۲، ۳۲۱	تاریخ الخلفاء للسیوطی	الاصابة فی أحوال الصحابة	۷۶
۱۶۸	تاریخ الاطلاق	الأغانی	۷۰، ۱۳۲، ۱۳۰
۱۰۲، ۹۸-۱۰۰، ۹۳، ۹۱، ۸۷	تاریخ الاسلام للذہبی	(رسالہ) الأتقلام	۳۱-۱۳-۷
۴۰	تاریخ اصبهان	انجام العوام عن علم الکلام	۱۸۷، ۱۸۶
۳۱۷	تاریخ الخطاط و سقوط روم	الفیہ	۱۸۳، ۱۸۷
۱۰۱، ۹۵، ۷۲	تاریخ بغداد	امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی	۶۸
۹	تاریخ دعوت و عزیمت	انجیل	۳۵۷، ۲۱
۹۴	تاریخ صغیر	انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا	۲۵۳، ۲۵۲، ۲۴۱، ۲۲۲
۹۵، ۵۰	تاریخ طبری	انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اینڈ آٹھلس	۲۵
۳۱۷	تاریخ عہد وسطی	ایضاح البرہان	۱۱۳
۱۴۵، ۱۲۲	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	(ب)	
۲۱۶، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	بال جبریل	۳۹۹، ۳۶۹	
۹۴	تاریخ کبیر	البدایہ والنہایہ	۳۹۹، ۳۸۱، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۰۶، ۱۹۷
۱۱۵	تاویلات القرآن		۳۳۰، ۳۲۱، ۳۱۸، ۳۱۳
۱۱۳	التبیین عن اصول الدین	ابرہان	۱۸۹

۱۴۶	بواہر القرآن	۱۸۹/۱۱۴/۱۳/۱۰۵-۸	تبیین کذب المفتری
۳۱۴/۳۱۳/۳۱۰-۱۲	چنگیز خاں (کتاب)	۲۸۱	تثبیت القبۃ
	(ح)	۴۹/۳۳	تذکرۃ الحفاظ
۱۲۷	حاضر العالم الاسلامی	۳۴۵	تذکرہ دولت شاہ
۱۴۶	حجۃ الحق	۲۸۸	الترغیب والترہیب
۳۰۲/۸۰	حجۃ الشریب الخ	۱۴۷	تعریف الأحياء بفضل الأحياء
۳۵۴	حدیقہ سنائی	۱۲۷	تفسیر مولوی محمد علی
۶۰	احسن البصری	۲۲۴	لقصار جہود الاحرار
۲۹۹/۲۹۸/۲۸۸	حسن المحاضرہ	۲۳۳	التکلمہ رموز الغیب
۲۴۷/۱۹۰-۱۸۹/۷۲	حلیۃ الاولیاء	۲۵۱/۲۴ (DISCOVERY OF INDIA)	تلاش ہند
۲۸۱	حامہ	۲۴۶/۲۳۹/۲۳۸/۲۳۴-۴۶	تبلیس البلیس
۳۰۷/۳۰۶	احداث الجامعہ	۲۵۰	تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والیسیر
	(خ)	۳۵۷	توریت
۱۱۳	خبر الواحد	۱۴۲-۴۵	تہافت الفلاسفہ
۷۷/۱۶	خطبات مدراس		(ج) (ج)
	(ی)	۸۰	جامع ترمذی
۳۱۴/۱۹۷/۶۶/۵۷/۵۲	دائرة المعارف للبستانی	۸۲	الجامع العلوم
۳۳۲/۳۳۰/۳۲۹/۳۲۳-۲۵	دعوت اسلام (آرٹیکل)	۴۰۰/۳۹۹	جاوید نامہ
۳۰۲	الدلائل المتعلقہ بالملائکۃ والانس	۲۰۱	جلال العینین

سیرت عمر بن عبد العزيز ۳۰۱۳ھ - ۳۰۱۴ھ	۳۲۳	دی گین
سیرة النعمان ۸۲	۳۴۹۱۳۵۵	دیوان مولانا روم
(ش)	(ذ)	
الشال ۲۴۸	۲۰۳۱۲۰۲۱۹۸	ذیل طبقات السخاوی
شجرة المعارف ۳۰۲	۳۲۱	ذیل المرأة
شذرات الذهب فی اخبار من ذهب ۸۲	(س)	
شرح احیاء العلوم ویکھئے اتحاد السادة	۱۱۹	الرد علی المنطقیین
الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الکفر والتفصیل ۱۱۳	۲۸۵۱۱۲۲	رسائل اخوان الصفا
شفار (ابن سینا) ۲۸۵	۲۱۴۱۲۱۲۱۰۱۲۰۹۱۲۰۶۱۲۰۵	رموز الغیب
(ص) (ض)	۳۲	رنات الثالث
صاحب المتنوی ۳۴۵۱۳۳۷	(ن)	
صباح ۷۹	۲۸۸	زاویہ غزالیہ
صحف مقدسہ ۲۱	۲۴۹۱۲۵۱۳۲۳۱۳۳۹	زندگانی مولانا جلال الدین
صحیح بخاری ۱۸۹۱۸۰۰۷۹۱۲۰	۳۵۴۱۳۵۲	
صحیح مسلم ۱۸۹۱۸۰	(س)	
صحیحین ۸۰	۲۶۲۱۲۵۴-۵۶	سلطان صلاح الدین (لین پول)
صفحة الصقوة ۲۴۷۱۵۱۱۳۳	۲۸۱۱۲۴۳۱۲۷۰۱۲۶۵۱۲۶۳	
صفحة النفاق ودم المنافقین ۶۵	۸۰	سفن الی داؤد
صلاح الدین الیوبی (محمد فرید) ۲۶۱	۳۶۰	سوانح مولانا روم

٢١٠-٢٠٨	الفتح الرباني	٢٨٦، ٢٨٥	الصواعق المرسلة
٢٤٨	الفتح القسبي في الفتح القدسي	٢٢١-٢٣١، ٢٣٩، ٢٢٣، ٢٢٢، ٢٢٤، ٢٢٩	صيد الخاطر ٢٠٩
٢٩	فتوح البلدان	٢٥٠، ٢٤٥-٢٨	
٢٠٩، ٢٠٨، ٢٠٦، ٢٠٥	فتوح الغيب	١٢٣	منحى الاسلام
٨١	فخر الاسلام	(ط)	
١٢٤	فرج اناسيكلوپيديا ان اسلام	٦٥	طبقات ابن سعد
١٢٦	فضائح الاباحية	٢٩٥، ٩٢	طبقات ابن السكيت
١٦٨	فلسفة الاطلاق وصلاتها بالفلسفة الاغريقية	٢٩٣، ٢٨٨، ١٣١، ١١٦	طبقات الشافعية الكبرى
٦٥	فوز الكبير	٣١٩، ٣٠٢، ٣٠٠، ٢٩٩، ٢٩٤، ٢٩٥	
١٨٦، ١٨٥	فصل التفرقة بين الاسلام والزندقة	٢٠٣، ٢٠٢، ١٩٩	طبقات الكبرى للشعراني
٢١٨، ٢١٤، ٢١٥، ٢١١، ٢١٠	فيوض يزداني	(ع) (غ)	
(ق)		١٢٥	عاصمة نفوس المهتدين وقاصمة ظهور المعتدين
١٢٦	قاصم الباطنية	٣٠٦	الحسين المسبوك
٢١٦، ١٩٩-٢٠٢	قلائد الجواهر	١١٥	عقائد عصرية
٨٢	قلائد العقود العتيقة	٤٩، ٤٦	علماء سلف
١٢٦	قواعد عقائد آل محمد	٢٢٣	معارف المعارف
٣٠٢	القواعد الكبرى	١٩٣، ١٨٩، ١٦٤، ١٣٤	الغزالي
١٣٣	قوت القلوب	(ف)	
٦٢	قيام الليل	١٨٣، ١٨٢	فتاوى شيخ الاسلام ابن تيمية

۲۸۲، ۸۰	موطا	۱۳۲، ۱۳۱	مقاصد الفلاسف
	(ن)	۱۱۴، ۱۱۳	مقالات اسلاميين
۱۲۸	نظام الملك طوسي	۶۹	مقدمه ابن خلدون
۱۶۱	نصيحة الملوك	۷۹، ۷۸	مقدمه فتح الباري
۳۳۷	نقد المثنوي	۳۲۶	مقريري توم
۲۶۷، ۲۶۴، ۲۶۲	النوادر السلطانية	۱۶۱	مكتوبات امام غزالي
۲۷۸ - ۸۱، ۲۷۶		۹۲، ۸۷	مناقب ابن الجوزي
	(و)	۸۱، ۶۸	مناقب ابی حلیف
۲۲۴	وفيات الاحيان	۹۲	مناقب حافظ ذهبي
۳۳۳، ۳۳	وہوسن	۳۳۳	مناقب العارفين
	(۷)	۳۸	مناقب عمر بن عبدالعزيز
۳۲۴، ۳۲۳	ہودرتھ	۱۸۴، ۱۸۳	المستظم في تاريخ الملوك والامم
۲۴	ہندوستانی تمدن	۲۵۷، ۲۴۹، ۱۹۷	
۳۲۶	ہیوم	۱۳۶، ۱۳۱، ۱۳۱	المنقذ من الضلال
	(ی)	۳۵۴	منطق الطیر
۳۶	یوسف زلیخا	۱۸۴، ۱۸۲، ۱۳۷	منہاج القاصدين
		۱۳۶	مواہب الباطنیہ

مقامات

۱۲۲، ۱۴۶، ۱۴۵	اندلس		(الف)
۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۳	انطاکیه	۳۱۳	اترار
۲۵۳	انطوطوس	۲۴۹	احار
۳۱۴، ۳۶۹-۴۱	انگلستان	۲۶۱، ۱۹۴	آذربایجان
۲۵۵	ایڈیا	۳۴۴، ۲۴۰	اردن
۳۰۴، ۳۶۱، ۱۹۴، ۱۲۴، ۱۸۸، ۱۸۰، ۱۴۸	ایران	۲۴۱	ارسوف
۳۴۰، ۳۳۹، ۳۳۳، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۶، ۳۱۲، ۳۱۱		۳۴۸	ارمن
۴۶، ۴۳، ۴۴	ایشیا	۲۴۲	ارمنیه
۳۱۰	ایشیا کوچک	۳۱۲، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۴۶، ۱۴۳	اسپین
۲۴۱	ایلیه	۲۴۰، ۱۲۶۹	آسٹریلیا
	(ب)	۱۶۱	اسفرائن
۹۶	باب البستان	۲۵۶، ۱۹۲	اسکندریه
۱۹۲	بجایہ	۱۲۸	اصقہان
۳۲۵، ۳۱۳، ۱۴۵	بخارا	۱۹۲	اغمت
۹۴	برز	۳۳۸	افغانستان
۲۴۰	برگندی	۲۲۱، ۱۸۲، ۱۴۶، ۱۴۳، ۱۵۰	افریقہ
۱۰۴۱۱-۵۱۸۴، ۱۸۶، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۵۴	بصرہ	۲۴۰	آقشہر

۳۳۴، ۳۱۳	زنجبان	خوارسان	۳۳۰، ۳۳۸، ۳۳۹، ۱۶۰، ۱۸۶، ۴۶، ۴۱، ۳۹	(خ)
۸۶	(س) سرخس	خلیج عجم	۳۱۱	
۲۲۱	سارطا	خوارزم	۳۱۳	
۳۱۴، ۱۱۱، ۱۱۵	سمرقند	(د)		
۳۳۳	سنجاس	دائرة شاه علم الشرع	۱۶، ۱۰	
۳۱۴	سویدن	دشت	۳۲، ۱۲۹۱-۹۳، ۲۸۸، ۳۸۴، ۱۳۶، ۶۴	
۴۶	سوینز		۳۵۱، ۳۵۴، ۳۳۴، ۳۳۲، ۳۳۰	
۳۲۵	سیردادرا	دیاب	۳۰۶، ۲۵۶	
	(ش)	دوین	۲۶۱	
۱۴۱، ۲۶۴، ۱۲۶، ۱۲۵، ۸۱، ۲۵۲-۵۶، ۸۴، ۸۰	شام	(س) (ش)		
۲۲۲، ۲۲۱، ۳۱۸، ۳۱۰، ۱۳۰، ۲۸۹، ۲۸۴-۸۶		رائے بریلی	۱۶، ۱۰	
۳۵۱، ۳۳۸، ۳۲۵		الرحا	۲۵۵، ۲۵۳	
۱-۴	شیراز	رحبہ عثمان	۴۹	
	(ص)	رقہ	۱۰۰، ۱۹۶، ۱۹۵، ۴۱	
۲۴۲	صحرانوبہ	رملہ	۲۴۶، ۲۴۰	
۱۳۶	صخرہ	روس	۳۱۴	
۲۴۰، ۲۶۹	صفلیہ	روم	۳۵۲، ۳۵۱، ۳۳۸، ۳۳۴، ۳۳۲، ۳۰۵، ۹۱	
	صفار	رے	۳۱۶، ۳۱۴، ۱۸۸	

۲۲۲، ۲۲۱	عین جالوت	۲۴۲	مور
	(ف)	۲۹۱	صیدا
۲۶۹-۴۱	فراش	(ط)	
۲۷۰	فلاندرز	۱۸۹، ۱۱۳۰	طابران
۲۷۰، ۲۶۳-۶۵، ۲۵۶، ۲۵۲-۵۴	فلسطین	۲۵۶، ۲۵۴، ۲۵۳	طرابلس الشرق
	(ق)	۹۵	طرس
۲۷۵، ۲۸۵	قاهره	۷۶	طنجه
۲۵۴	قدس	۱۸۵، ۱۸۷، ۱۶۲، ۱۱۳۰	طوس
۲۱۳	قراقرم	۳۱۸	طهران
۲۱۴	قزوین	(ع)	
۲۷۲	قطنطیه	۸۸، ۸۶، ۷۷، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	عالم اسلام
۲۹۰	قصیرہ	۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۳، ۱۲۱، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	قونیہ
۲۴۴	قصیرہ	۲۱۲، ۲۱۱، ۲۹۵، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۷۳، ۲۶۲، ۲۵۵	
	(ل) (ک)	۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۵-۲۷۰، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	کاشغر
۲۲۲، ۲۲۱	کاشغر	۲۹۸، ۲۹۷	عم
۲۲۳	کانسوا	۱۹۷، ۷۵	عرب
۲۷۲	کردستان	۲۷۱، ۳۴	عک
۲۹۳	کرک	۲۸۱، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۵۳	

۲۴۳	انکاسه	۲۴۳	کرمانشاه	۲۴۳
۷۶	کلکته	۷۶	ملاطیه	۳۴۰
۶۸۱۵۷	کوفه	۶۸۱۵۷	منصوره	۲۹۵
۳۱۷	کیمبرج	۳۱۷	موصل	۲۷۱، ۲۵۸، ۲۵۵
۳۴۰	لارندا	۳۴۰	موندیسج (بیت اللحم)	۲۵۲
۱۱	لکهنؤ	۱۱	مهدیه	۱۹۲
۳	مازندان	۱۹۷	نابلس	۳۰۵
۱۱۴، ۱۴۹	ماوراءالنهر	۱۱۴، ۱۴۹	نیشاپور	۳۱۴، ۱۸۷، ۱۳۹، ۱۱۷، ۱۱۶
۲۵۴، ۱۳۷، ۱۶۸، ۱۶۴، ۱۳۶، ۱۳۲، ۱۳۱	مدینه منوره	۲۵۴، ۱۳۷، ۱۶۸، ۱۶۴، ۱۳۶، ۱۳۲، ۱۳۱	میرات	۳۳۹
۳۰۵، ۲۶۶	مراکش	۳۰۵، ۲۶۶	میدان	۳۱۶، ۳۱۴
۳۱۴، ۱۸۶	مرد	۳۱۴، ۱۸۶	هندوستان	۲۲۴، ۲۲۱، ۱۲۷، ۱۴۹، ۲۴۰، ۲۶، ۱۵، ۹
۱۱۴	مشرع الزوایا (بغداد)	۱۱۴	میرات	۳۹۸، ۳۱۶، ۱۳۰، ۲۵۰
۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۶، ۱۹۲، ۱۱۵، ۸۲، ۸۰، ۷۵	مصر	۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۶، ۱۹۲، ۱۱۵، ۸۲، ۸۰، ۷۵	میرات	۲۷۱، ۲۷۰، ۲۵۴
۲۸۸، ۲۸۵، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۷۱، ۲۶۷، ۲۶۶	میرات	۲۸۸، ۲۸۵، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۷۱، ۲۶۷، ۲۶۶	میرات	۲۲۱، ۱۸۸، ۷۶، ۱۴۴، ۱۳۸
۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۱، ۳۱۰، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۹۰، ۹۹	میرات	۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۱، ۳۱۰، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۹۰، ۹۹	میرات	۲۶۸، ۷۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳
۲۸۵، ۱۹۲، ۱۱۵، ۲۹	مغرب	۲۸۵، ۱۹۲، ۱۱۵، ۲۹	میرات	۲۶۹، ۲۵۴، ۲۵۲، ۱۹۳، ۷۶، ۷۳، ۳۸، ۲۲
۱۸۸	میرات	۱۸۸	میرات	۳۹۸

متفرقات

قلعہ نہر و دریا:

بیت المقدس - مسجد اقصیٰ ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۳، ۱۳۶

۲۹۲، ۲۸۶، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۷، ۲۶۲
۲۰۳

۲۸۸

جامع اموی

۱۳۶

جامع مسجد دمشق

۲۵۱

جامع منصور بغداد

۲۵۳

مسجد عمر

۱۲۶

باب کعبہ

۲۵۴

روضۃ الطہر

۲۰۳

مطاف

۲۲

چرچ

۲۲

کلیسا

درس گاہیں، ادا لے اور مطابح:

۲۵

الفنن کالج بمبئی

۱۶۸

جامعۃ القاہرہ

۳۱۸

طہران یونیورسٹی

۳۴۲

مدرسہ طلاویہ - حلب

۳۴۱

مدرسہ خداوندگار

۳۲۱

قلعہ الیسیان

۲۶۱، ۲۵۶

قلعہ بانیاں

۲۶۱

قلعہ بعلبک

۲۶۱، ۲۵۶

قلعہ حارم

۲۵۹

قلعہ حصن الاکراد

۷۶

بحر احمر

۳۱۰

بحر خوارزم (آرال)

۱۹۷

بحر قزوین

۲۴

بحر الکابل

۲۴

بحر ہند

۳۱۰

خلیج عجم

۳۰۶

دجلہ

۳۰۶، ۲۵۵

قرات

۲۳۶

کوہ طور

مساجد و مقدس مقامات و معبد:

۳۰۷، ۲۰۳، ۱۱۲۶

بیت اللہ شریف (کعبہ)

۱۲۶/۱۲۴	جنت	۳۲۹	مذہب شامان
۹۱	جہاد	۳۲۳، ۲۰-۲۳۱۱۰	مذہب عیسائی- مسیحیت
۱۶۴/۱۳۷/۱۲۶/۱۲۴/۱۸۸/۳۶	حج و زیارت	۲۶-۲۸	(عقیدہ) وحدۃ الوجود
۸۸'۸۴'۷۸-۸۱'۷۳-۷۵'۴۰-۱۲۹	حدیث	۲۲-۲۵/۱۱۰	ہندومت- ہندو مذہب
۱۸۴/۱۸۳/۱۷۷-۱۳۹/۱۳۳/۱۲۵/۱۸۹			مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:
۱۵۹/۱۲۴	حرام	۱۳۳	اجماع
۱۵۷/۱۲۴/۱۹-	حلال	۱۴۸/۱۳۵/۱۲۶	آخرت
۱۵۷/۱۴۷/۱۳۸	خراج	۴۳	استلام
۱۲۷	ختم نبوت	۷۳/۵۳	اسلامی معاشرہ
۱۵۳/۱۳۱/۶۷/۵۱/۴۰/۳۹/۳۵/۲۹/۱۸۹	خلافت	۱۵۵/۱۵۴	بحث و مناظرہ
۱۲۷	دجال	۱۹۱/۸۱	بیعت
۱۲۶/۱۲۴	دوزخ- جہنم	۱۵۵	تذکرہ
۱۲۴	رسالت	۱۴۷/۱۳۶	ترکیہ
۴۱	رسم حلف- مخالفت	۲۲۴/۱۹۱/۱۶۳/۱۴۷/۱۴۶/۱۳۸	تصوف
۱۵۷	رشوت	۸۵	تقدیر
۱۲۶/۱۲۴	روزہ- صیام	۱۵۵/۲۵	توحید
۱۵۱	ری	۴۱/۳۲/۳۱	جاہلیت
۸۵	رؤیت باری	۸۵	جبر و اختیار
۱۲۶/۱۲۴/۵۰	زکوٰۃ		
۱۵۱	سبق	۴۷/۳۷	جزیہ

۱۲۶/۱۲۳/۱۱۱/۸۹/۶۵	وحي	۱۰۴/۱۰۲/۹۸/۹۴/۹۲/۸۹/۳۹/۳۱/۲۹	سنت
۱۲۷	وصو	۳۰۵/۲۸۵/۲۸۳/۲۳۴/۲۳۳/۲۳۳/۲۰۲/۱۱۱	
علوم و فنون:		۱۲۴	شریعت
۱۳۳	اخلاقیات	۱۲۶/۱۲۳	ملاطه نماز
۱۰۸	اصول فقه	۱۵۱	ظهار
۱۳۲/۱۳۳/۱۲۲	ریاضیات	۶۹	عجمی روح
۳۹۸	سائنس	۶۹	عربی روح
۲۶	سنگرت	۱۲۸	عقل اول
۱۳۳	سیاسیات	۱۲۷/۱۲۴	فرض واجب
۱۳۲/۱۳۱/۱۳۴/۱۳۳/۱۲۸/۱۲۲	طبیعیات	۶۳	قیامت
۱۲۰	علم الاصاب	۱۵۱	لعان
۱۳۶	علم تصوف	۱۲۴	مبدأ اول
۱۲۸/۱۲۷/۱۱۸/۱۱۵/۱۱۳/۱۰۸/۲۹/۲۸	علم الکلام	۸۵	منته
۱۸۶/۱۸۴/۱۶۳/۱۵۵/۱۵۴/۱۴۵/۱۴۱/۱۳۳		۱۲۷	مستحب
۳۸۴/۳۶۸/۳۶۵/۳۶۴/۳۶۲/۳۳۵/۸۷		۱۲۶/۱۲۴/۱۲۳	معاد
۳۹۸/۳۹۲/۳۸۳			
۱۲۸	علم ہیئت	۱۸۴/۱۷۷/۱۷۷/۱۳۴	معجزه
۲۸۷	علوم شرعیہ	۱۵۹/۱۲۶/۱۳۴	ملائکہ
۱۸۹/۱۳۲/۱۲۸/۱۲۲/۱۱۳	علوم عقلیہ عقلیات	۱۲۴/۱۲۳/۱۱۱/۸۹/۵۷/۵۴/۵۳/۳۹/۳۷	نبوت
۱۹۱		۱۳۸/۱۲۷/۱۲۶	
۱۹۰/۱۸۹/۱۲۸	علوم نقلیہ	۱۲۷	نزول مسیح
۱۵۵/۷۴/۷۳/۲۹	فقه	۶۳-۶۶	نفاق

حکومت امویہ - خلافت امویہ ۶۹، ۶۷، ۵۸، ۲۴	۸۲	فقہ اسلامی
خلافت راشدہ ۳۵، ۳۱	۱۶۷، ۱۳۰، ۸۲	فقہ شافعی
خلافت عباسیہ سلطنت عباسیہ ۱۸۸، ۸۵، ۶۹، ۶۷، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳-۷	۸۲	فقہ مالکی
نوارزمی سلطنت ۳۰۸	۱۲۴، ۱۲۸، ۱۲۵، ۱۲۳، ۱۱۹-۲۱، ۱۱۱، ۸۳، ۲۹، ۲۵	فلسفہ ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۲۵، ۱۲۳، ۱۱۹-۲۱، ۱۱۱، ۸۳، ۲۹، ۲۵
دولت ایلمانیہ ۳۲۶	۳۹۶، ۳۳۵، ۱۸۲، ۱۵۶، ۱۴۴-۳۶، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۸، ۳۹۸	۳۹۶، ۳۳۵، ۱۸۲، ۱۵۶، ۱۴۴-۳۶، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۸، ۳۹۸
دولت مغلیہ ۳۳۳، ۳۲۹	۱۶۸	فلسفہ اخلاق ۱۶۸
خقانیہ سلطنت ۳۳۳، ۳۳۲	۱۲۴، ۱۳۳، ۱۲۸، ۱۱۲-۲۲، ۱۸۳	فلسفہ الہیات - الہیات ۱۲۴، ۱۳۳، ۱۲۸، ۱۱۲-۲۲، ۱۸۳
سلجوقی سلطنت ۳۱-۱۲۵، ۳۱۲، ۲۵۲	۷۶	فن اسرار الرجال ۷۶
عبیدی سلطنت (فاطمی) ۲۸۳، ۳۸۲	۸۵	مسئلہ عدل ۸۵
لاطینی سلطنت ۲۵۵	۱۴۵	معقولات ۱۴۵
ولایت انطاکیہ ۲۵۳	۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۳	منطقیات ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۳
عہد وادوار:	۱۲۲، ۱۲۰، ۱۸۵، ۱۸۴	یونانی فلسفہ ۱۲۲، ۱۲۰، ۱۸۵، ۱۸۴
زمانہ صحابہ ۸۰		زبان:
عہد اموی ۸۶، ۱۴۱، ۳۱-۳۳	۱۲-۱۸۴	سریانی ۱۲-۱۸۴
عہد رسالت - عہد نبوت ۱۳۸، ۱۸۰، ۶۵، ۶۴	۱۲۰، ۱۲۶، ۲۵	سفر ۱۲۰، ۱۲۶، ۲۵
عہد صدیقی ۸۶	۱۲۰، ۱۳۳	عربی ۱۲۰، ۱۳۳
عہد عباسی ۳۰۶، ۲۰۶	۱۲۰	فارسی ۱۲۰
سکے:	۱۲۰	یونانی ۱۲۰
اشرفی	۳۲۳	سلطنتیں و حکومتیں:
		تاریخ سلطنت

۲۵۴	واقعہ ارتداد	۳۳۱	چاندی
۲۵۹	واقعہ احسن الاکراد	۷۷۱۶۹۱۳۶	دینار
۶۸	واقعہ کربلا	۶۹	روپیہ
۲۶۴	جنگ حطین	۳۳۱۳۲	سونا
۳۲۷	جنگ خارا	۶۹	قنطار
۲۵۹	معرکہ بقیعہ	۷۷	گنی
دیگر متفرقات :		تحرکات و سلاسل طرق :	
۲۴-۲۶	بت - مورت	۲۸۵۱۲۲۱۲۱	اخوان الصفا
۲۸۴	جرمیر	۱۱	جماعت اصلاح و تبلیغ بکھنؤ
۱۸۱	چھاق	۱۲۱	فری مشن
۳۳	حجر اسود	۲۲۱	سلسلہ قادریہ
۱۷۷	ترقوم	۲۲۴	طریقہ سہروردیہ
۱۷۵	شطنج	اہم واقعات و معرکے :	
۲۸۸	صلوۃ الرغائب	۱۴۶	آتش نرود
۳۲۰، ۳۲	صلیب	۱۲۶	ذبح ابراہیم
۲۰۸	صنوبر	۱۲۶	طوفان نوح
۷۰	عنبر	۱۲۶	عصائے موسیٰ
۷۵	فرسخ	۱-۳	فقہ الاعتزال
۷۰	مشک	۱۲۳	فقہ باطنیت
۲۸۲	ملوخیہ	۳-۳۱۹	فقہ تاتار
۹۱	منجیق	۹۵۱۹۴۱۹۱۹-۱۸۴	فقہ خلق قرآن